سلسلۂ تصنیفات مسلم بک سوسائٹی نمبر ۲

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون

# ذرّاتِ عالم کا مذہب

یعنی

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری (امام مسجد ووکنگ)

کی

انگریزی تصنیف

## ریلیجن آف ایٹمس

کا

## اُردو ترجمہ

جس کو

مُسلم بُک سوسائٹی۔ عزیز منزل لاہور نے

دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع کیا
مطبوعہ کریمی پریس لاہور

# بلاد غربیہ میں اسلام کا مشعلبردار

## اسلامک ریویو مجریہ انگلستان قیمت سالانہ صہ

اس کا اردو ترجمہ رسالہ

# اشاعت اسلام لاہور

قیمت سالانہ ۱ر

ایڈیٹر۔ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی مسلم مشنری

مسلم پبلک میں اسلامک ریویو کسی معرفت کرانے کا محتاج نہیں صرف برادران اسلام کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں۔ کہ اس وقت اسی کے منافع پر انگلستان میں اسلامی مشن کے اخراجات بہت حد تک چل رہے ہیں۔ اس کا ہر ایک خریدار اب گویا بلاد غربیہ میں اسلام کا خود متکفل ہو جاتا ہے۔ اگر برادران ملت کوشش کر کے انگریزی رسالہ کے پانچہزار اور اردو کے دس ہزار خریدار پیدا کردیں تو ان کا منافع ہمارے ووکنگ اسلامی مشن کا کفیل ہو سکتا ہے ہم چاہتے ہیں۔ کہ انگریزی رسالہ کئی ہزار تک بلاد غربیہ میں مفت تقسیم ہو۔ اگر کوئی تبلیغ اسلام کا شیدائی ہمیں چار روپے سالانہ بھیجدے۔ تو ہم انکی جگہ ایک انگریزی رسالہ یورپ میں مفت تقسیم کرینگے۔ کیا ملت بیضا کی اشاعت کے عاشق چند ہزار بھی ہندوستان میں نہیں؟ دوستو اٹھو! جاگو!! وقت کو غنیمت سمجھو!!! اسلامک ریویو ایک کامیاب ذریعہ اشاعت اسلام کا ثابت ہوا ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ اس نے اپنی عزت کو یورپ میں نہایت آب و تاب سے قائم کیا ہے اسکو مضبوط کرنیکی کوشش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل پاؤ گے + والسلام

المشتہر۔ خواجہ عبد الغنی مینیجر رسالہ اسلامک ریویو و اشاعت اسلام عزیز منزل لاہور

# معنون

## بیادِ محبوب اُستاذی و مُرشدی

تقدّس مآب حضرت حکیم نورالدّین رحمۃ اللہ علیہ و برکاتہ

جن کی ذات بابرکات میرے انشراحِ صدر کی اوّلین
موجب ہوئی کہ مطالعہ مذہب کی بنا قوانینِ قدرت پر رکھوں۔

کمال الدین

# دیباچہ

ایک مُدّت سے یہ سودا سر میں سمایا رہا کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے مذہب و سائنس کے درمیان رشتۂ مطابقت ثابت کرنے کی غرض سے مُتعدّد لیکچر دوں۔ یہ چند اوراق اپنی طرف سے اس ناچیز کوشش کا ایک نہایت ہی قلیل حصّہ ہیں جن کا موجودہ شکل میں نمودار ہونے کے لئے اگر کوئی معذرت ہے تو وہ مصنّف کی موجودہ ناسازئی طبیعت اور طویل آرام کیلئے طبّی مشورہ ہی ہیں۔ صحّت پہ اس کی تکمیل کا پختہ ارادہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ ؛

الـمسجد دوکنگ
۱۵ فروری سنہ ۱۹۱۹

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

# ذرّاتِ عالم کا مذہب

## (۱) مذہب اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوات والارض طوعًا وکرھًا والیہ یرجعون ۰

**ترجمہ** - کیا وہ خدا کے دین کے سوا کسی دوسرے مذہب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں (حالانکہ) جو کچھ بھی زمین و آسمان میں ہے طوعًا وکرہًا خدا کی تابعداری کرتا ہے اور اُس کی طرف سب کچھ اُٹھایا جائیگا +

بادی النظر میں سائنس اور مذہب ایکدوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں - مگر حقیقت یہ ہے کہ دُنیائے سائنس میں ہماری تمام تحقیقاتیں قرآن شریف کی اسی آیت شریفہ پر مبنی ہیں کہ

لہٗ اسلم من فی الارض طوعاً و کرھاً و الیہ یرجعون

اگر مذہب سے مُراد کسی شخص یا کسی خاص و اقعۂ تاریخی یا خدا تعالےٰ کی صفات مفروضہ میں سے کسی خاص صفت پر محض ایک ایسا یقین ہے جسکے ساتھ عمل کی ضرورت نہیں بلکہ جو بذاتِ خود صرف اعجازی رنگ میں حصول نجات کیلئے یا بدنما اشجار کو خوشنما بنا دینے میں اپنے کرشمے دکھاتا ہے تو بیشک مذہب اور سائنس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو سائنس کے ساتھ مشترک سمجھی جائے لیکن اگر اسکے برخلاف مذہب سے مُراد ایک مجموعہ قوانین ہے - اگر مذہب کی غرض یہ ہے کہ ہمارے قوائے فطریّہ کو ظاہر کرے - اور ان کے نشو و نما کے طریق ہم کو بتائے - اگر مذہب ہمیں چند ایسے مسائل سکھاتا ہے جن پر عمل کرنے سے ہمارے قویٰ کی تکمیل ہوتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی وجہ تضاد ہو سکتی ہے - اسمیں شک نہیں کہ مذہب کی ابتدا ایمان یا محبّت سے ہوتی ہے - لیکن کیا سائنس اِس امر میں مذہب کی مقلّد نہیں ؟ سائنس کی تمام سرگرمیاں مبدا ان عبودیّت میں ہی جولانیاں دکھاتی ہیں ہر ہیولیٰ جس کی ماہیت پر پردۂ خفا پڑا ہوا ہے سائنس کے محققانہ قویٰ کو تحریک دیتی ہے - اِن اشیاء عالم کی مستور

فطرتیں ہی سائنس کو ترقی کرنے کیلئے مجبور کرتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آئے دن سائنس کی تحقیقات میں نئے معلومات اضافہ ہوتے رہتے ہیں +

سائنس خود کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی بلکہ اسکی بسم اللہ اس اصول یا یقین سے شروع ہوتی ہے کہ دنیا میں چند غیر متبدل و غیر متغیر قوانین موجود ہیں جو تمام مادی اشیاء پر حکومت کر رہے ہیں۔ اور اس طرح سے ان اشیاء کی مختلف خاصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ کسی چیز کی خاصیت بھی سائنس کی نظر میں وہ خاص نتائج ہیں جو اس چیز کو خاص قوانین کے ماتحت میں لانے سے نکلتے ہیں۔ ان ہی نتائج کو معلوم کرنا۔ سائنس کا نصب العین ہے۔ اور اس قسم کے قوانین کو ہی پوری طرح اپنے احاطۂ قدرت میں کر لینے سے سائنس کے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں +

اگر دنیا میں مادہ کا ظہور ایک علت اولےٰ کے وجود سے ظاہر ہوا ہے تو ہمیں اسی علت اولےٰ کو تمام قوانین کا ماخذ بھی ماننا پڑیگا۔ سائنس کی تمام تحقیقاتیں یا تو ان ہی قوانین الٰہیہ کی ٹوہ لگاتی ہیں جو صحیفۂ فطرت میں ذراتِ عالم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اور یا ان قوانین کی پوری تابعداری کے اصولوں کا پتہ لگاتی ہے۔ جن سے مادے کے قوائے

فطرتیہ کے نئے نئے مظاہر نظر آتے ہیں +

قوانین آلہیہ یا دوسرے لفظوں میں قوانین فطرت (اسلام) کی اطاعت سائنس کا سب سے بڑا اصول ہے اور یہ اصول ذرات عالم کی طبیعت میں ودیعت کیا جا چکا ہے۔ اور اسلئے اس کو سالمات کا مذہب یا ذرات عالم کا مذہب کہہ سکتے ہیں +

صحیفۂ فطرت کو نہایت سرسری نگاہ سے دیکھنے والا شخص بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کریگا۔ کہ نیچر کے تمام اجزاء چند قوانین مقررہ کی پوری پوری تابعداری کرتے ہیں۔ ان اجزاء کا وجود ان کے باہمی تعلقات اور ایکدوسرے کے خدمات جن پر دنیا جہان کے نظام کی خیر و خوبی سے چلنے کا مدار ہے ان میں قوانین کی پوری اطاعت پر منحصر ہے +

ذرا فرض کے طور پر خیال تو کرو کہ اگر ایک حقیر سے حقیر ذرہ بھی اس دنیا میں اپنے مفوضہ طریق کو چھوڑ کر ایک منٹ کے لئے بے راہ ہو جائے۔ تو اس بے راہ روی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام دنیا کا ڈھانچ بکھر کر تباہ ہو جائیگا +

سورج چاند اور ستاروں کی طرف دیکھو۔ پھر دن رات موسم۔ درختوں اور سمندر پر غور کرو کہ ان میں سے

ہر ایک کیلئے ایک خاص راستہ مقرر ہے جس پروہ نہایت پابندی سے قدم مار رہا ہے۔ اور تاریخ میں ایک منٹ بھی ایسا نہیں آیا۔ کہ اسمیں کوئی چیز ذرا بھی ادھر اُدھر ہوئی ہو +

اس حقیقت نفس الامری کے چہرہ سے موجودہ سائنس کے وجود سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے ان الفاظ میں نقاب اُٹھا دیا :-

(۱) وللہ یسجد من فی السموات والارض طوعاً وکرھاً وظللھم بالغدو والاصال ۰

ترجمہ - جو کچھ زمینوں اور آسمان میں ہے - اور نیز ان کے سائے خدا کی تابعداری میں صبح وشام مصروف ہیں

(۲) وایۃ لھم الیل نسلخ منہ النھار فاذا ھم مظلمون ۰ والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم ۰ والقمر قدرنٰہ منازل حتیٰ عاد کالعرجون القدیم ۰ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون ۰

ترجمہ - اور رات بھی ان کیلئے ایک نشان ہے ہم اس سے دن نکالتے ہیں - اور تب وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں - اور سورج اپنی میعاد مقررہ تک گھومتا ہے - خدائے غالب وعلیم کا اندازہ ہے اور چاند کے لئے بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں - یہانتک

کہ پھر وہ خشک ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔ سورج کو یہ طاقت نہیں کہ وہ چاند کو پکڑ لے۔ اور نہ ہی رات دن پر سبقت لیجا سکتی ہے۔ اور ہر ایک اپنے اپنے احاطہ میں تیر رہے ہیں ❊ کیا ہی روشن حقیقت ہے کہ ہر ایک اپنے احاطہ میں گھوم رہا ہے +

اِس حقیقت کو کہ دُنیا میں قانون کی حکمرانی ہے صحیفۂ فطرت میں ایک باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے مذکورہ بالا الفاظ میں موجودہ مغربی سائنس سے بہت پہلے ظاہر کر دیا تھا۔ صحیفۂ فطرت کا ہر ایک جُز اپنا کام کر جاتا ہے۔ اسمیں کسی قسم کی خلاف ورزی یا تجاوز ممکن نہیں۔ بلکہ ایک مقررہ اور غیر متبدّل قانون کی پوری تابعداری معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے متخالف و متضاد آپس میں شیر و شکّر ہو کر ایک مجموعہ بن جاتے ہیں۔ اور مختلف اشیاء سلک انتظام میں منسلک ہو کر نظامِ عالم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں + جیسا کہ قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے کہ عالم کا آئین عام باقاعدگی اور قانون کی پابندی ہے صحیفۂ قدرت کا ہر ایک ذرہ اپنی ہستی اور آیندہ ترقی کمال کے لئے ایک قانون کی پابندی کا مرہونِ منّت ہے ❊

ہوا کے ذرات کو ذرّاتِ برقی کی صورت میں تبدیل ہونے

کے لئے ایک خاص مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی طرح
اِن ذرّات برقی کو جب ایک انتظام کے ماتحت کہا جاتا ہے
کہ ان سے کائنات عالم کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور
مادّی ارتقائی ترقیات ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ غرض صحیفۂ
فطرت میں یہی نظارہ نظر آتا ہے کہ خاص خاص اصولوں
کی پابندی سے ایک نیا نظام پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اور
صرف یہی باقاعدگی سائنس کی تمام تحقیقاتوں کا منبع ہے
جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں
کرتی۔ بلکہ اسکی تگ و دو صرف ان قوانین کی دریافت تک
ہی محدود ہے جو نیچر کی طاقتوں کی راہنمائی کرتے ہیں +

یہ قوانینِ فطرت ہی سالمات کا مذہب ہے۔ اگر اس امر
کا یقین نہ ہو کہ قوانینِ فطرت غیر متبدّل اور اٹل ہیں۔
اور قوانین فطرت بھی نہایت پابندی سے انکی تابعداری
کرتے ہیں تو سائنس کی تمام تحقیقاتیں نہ صرف اکارت
ہی جائیں بلکہ ناممکن الوقوع بھی خیال کیجائیں۔ اس پر
یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہ نظام کسی ارادے کے
ماتحت ہے۔ یا خود بخود اشیاء عالم آپسمیں مربوط ہیں۔
اسکے جواب کیلئے ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔ کہ کیا قدرت
ایک معینہ اور مقررہ اصول پر نہیں چلتی؟ کیا مادے پر

قانون کی حکمرانی نہیں؟ اگر صحیفۂ فطرت کا ارتقاء اتفاقیہ بیقاعدہ اور غیر منضبط ہوتا تو پھر ہم یہ کہ سکتے تھے۔ کہ قدرت میں بنفسہٖ ایک تطبیق موجود ہے۔ اور یہ قانون قدرت محض اس کا نتیجہ ہے لیکن سائنس نے ہمیشہ یہ مشاہدہ کیا ہے کہ دنیا میں نظام اور باقاعدگی ہی کائنات عالم کی روح رواں ہیں۔ اور سائنس کی تحقیقاتیں صرف اُن قوانین کے متعلق ہیں جو مادہ پر حکومت کرنے کیلئے وضع کئے گئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کی کل ایک مدرک اور مُدبر باالارادہ ہستی کے ہاتھ سے چل رہی ہے ہم ذیل میں اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی تصنیف ”اسلامی اصولوں کی فلاسفی“ سے چند سطور نقل کرتے ہیں جو فاضل مصنف نے خدا تعالیٰ کی ہستی کو معقول طور پر ثابت کرتے ہوئے لکھی تھیں:۔

(۱) ”اگر ان کا درپردہ کوئی مُدبّر نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ یہ دلیل ہیئت پر غور کرنیوالوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے۔ کیونکہ اجرام فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشان اور بیشمار گولے ہیں جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دُنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرتِ حق ہے۔ کہ وہ آپس میں نہ ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ

اِتنی مُدّت کام دینے سے کچھ گھسے۔ اور نہ اُنکی کلوں پُرزوں میں کچھ فرق آیا۔ اگر سر پر کوئی محافظ نہیں تو کیونکر اِتنا بڑا کارخانہ بیشمار برسوں سے خودبخود چل رہا ہے۔ انہیں حکمتوں کی طرف اشارہ کرکے خدائیتعالیٰ دوسرے مقام میں فرماتا ہے۔ افی اللہ شک فاطر السمٰوات والارض یعنی کیا خدا کے وجود میں شک ہوسکتا ہے جس نے ایسے آسمان اور ایسی زمین بنائی"+

## (۲) سب سے طاقتور ذرّے (یعنی انسان) کا مذہب

کیا اِنسان خُلاصۂ کائنات کامل و مکمّل مخلوق (خدا) اور اور فطرت کی بہترین صنعت نہیں؟ ضرور ہے کہ یہ بہترین ہستی فطرت کے بہترین اجزا سے مرکّب ہے۔ اور انہی اجزا لطیفہ کے معمولی مرکب سے حضرتِ انسان میں آثار زندگی عقل۔ فہم۔ جذبات اور شعور پیدا ہوتے ہیں سالمات اپنی شکل کو تبدیل کرسکتے ہیں۔ مگر اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ عناصر کی معیّت میں قوانین فطرت کی اطاعت اور اس اطاعت سے عجیب و غریب اور نہایت پسندیدہ

سلہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

نتائج کا استخراج ودیعت ہے۔ کیا یہ عناصر جب انسان میں مجتمع ہونگے۔ تو اس جبلی خاصیت کو چھوڑ دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر فی الواقعہ عناصر انسانی قالب میں جمع ہو جانے سے قانونِ فطرت کی سماعت سے فاخر ہو جاتا تو پھر کسی شخص کے لئے ممکن نہ تھا۔ کہ وہ علوم طبعی کے متعلق کچھ انکشافات کر سکتا +

قانونِ تناسب۔ قانونِ تربیت۔ اور قانونِ ترکیب وغیرہ کو ہی جب ایک نظم کے ماتحت کیا جائے تو سائنس بن جاتی ہے۔ اور تو اور اگر قوانین انسانی کے عمل کو نہایت سرسری نگاہ سے دیکھا جائے۔ تب بھی یہی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ انسان میں مختلف قوٰے موجود ہیں مثلاً آنکھیں۔ کان اور مُنہ اگر اُن کو ایسے کام پر لگایا جائے۔ جن کے لئے یہ وضع نہیں کیئے گئے۔ تو ان کو صدمہ پہنچیگا۔ اور ممکن ہے کہ اُن کی ہستی معرضِ خطر میں ہو۔ مگر یہ قوٰی محض ایسے خلاف فطرت کام کرنے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ اگر ان کو قانون مقررہ کے ماتحت استعمال کیا جائے۔ تو وہ تم دیکھو گے کہ وہ تمہارے کیسے تابعدار رہیں۔ یہی قاعدہ یعنی "اطاعتِ قانون" تمام قالبِ انسانی میں جاری وساری ہے۔ اسلام جس کے

لغوی معنے اطاعت قانون ہے حقیقت میں سالمات کا مذہب ہے۔ اور ان میں ہر ایک خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا ہو اس قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے ÷

عناصر کی ہر چیز میں بعض فطرتی اور پیدائشی نقص پائے جاتے ہیں۔ اور سائنس کی تحقیقات نسلاً بعد نسلاً ان خواص کے علم کو وسیع کر رہی ہے۔ نیچر کے ملک میں انسانی سرگرمیوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں بھی ترقی صرف اسی حالت میں ہو سکتی ہے۔ جب ہم بعض قوانین کا پتہ لگا کر ان کی پیروی و اطاعت کریں۔ اگر ہم قوائے فطرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ یا ان کی حالت بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ گوہر مقصود قوانین کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک معمولی انسانی فعل یعنی زراعت یا کاشت ہی لیلو۔ اگر قوانین کی پیروی نہ ہوگی۔ تو خاک بھی نتیجہ نہیں نکلیگا۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم زمین میں ایک خاص وقت پر ایک خاص طریقے سے ہل چلائیں۔ پھر ایک مقررہ طرز سے تخم ریزی کریں۔ قوانین ہی کی مطابقت کرتے ہوئے کھاد اور پانی دیں۔ اگر سر مو بھی مقررہ قوانین کی مخالفت ہوگی تو نتیجہ نقصان اور تباہی ہوگا۔ پس ثابت ہؤا۔ کہ اسلام کائنات اور ذراتِ

عالم کا مذہب ہے۔ اور اگر انسان بھی نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ تو اس کو بھی اسلام کا پابند ہونا چاہئیے۔ اسی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن شریف نے فرمایا۔ و من یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخسرین (سورہ آل عمران آیت ۸۴)

**ترجمہ**۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے۔ تو خدا کے ہاں اس کا وہ دین مقبول نہیں اور وہ آخرت میں زیاں کار ہوگا۔

الغرض قانون کی اطاعت ہر ذرہ عالم کی فطرت اور ہر ایک جان کی پیدائشی خاصیت ہے۔ تو کیا انسان۔ جو اشرف المخلوقات ہے۔ اس فطری خاصیت کے خلاف عمل کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کی طرف خدا کی آخری کتاب نے فرمایا۔ کہ تمام کائنات کا مذہب جسمیں انسان بھی شامل ہے اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ فرمایا۔ فاقم وجھک للدین حنیفًا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (سورہ الروم آیت ۳۰) **ترجمہ**۔ تم ایک خدا کے ہوکر اس کے (دین) کی طرف اپنا رخ کئے رہو۔ یہ خدا کی (بنائی ہوئی) فطرت ہے جس پر خدا نے

لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ بہت سے لوگ نہیں جانتے +

اِس مسئلہ میں عیسائیت اور اسلام کے اصولوں میں نُمایاں فرق ہے۔ عیسائیت تو یہ تعلیم دیتی ہے۔ کہ انسان میں گناہ فطری اور پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے۔ اور اسلئے اِنسان اس قابل ہی نہیں کہ قوانین کی پیروی کرے یا بالفاظ دیگر کسی مقررہ راستے پر قدم مارنا یا کسی حکم کی تعمیل کرنا اِنسان کی استعداد اور قابلیت سے باہر ہے۔ یا یُوں کہیئے کہ عیسائی کلیسیا نے اِنسان کا رُتبہ ذلیل حیوانوں سے بھی کمتر رکھا ہے۔ حیوانوں میں تو قوانین کی اطاعت فطری اور پیدائشی طور پر پائی جاتی ہے۔ لیکن حضرتِ اِنسان باوجود ان سے اعلےٰ و اشرف ہونے کے کسی قانون پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے +

• جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اِنسان مختلف ذرات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک ترقی کرنے کیلئے قوانین کی پیروی کر رہا ہے۔ تو کیا انسان کے لئے بحیثیت ان ذرات کا مجموعہ ہونے کے ضروری نہیں کہ وہ بھی ترقی اور اصلاح کے لئے بعض قوانین کی اطاعت کرے۔ اگر ہر ذرّے کی ہستی اور ترقی کسی مقررہ قانون کی اطاعت سے وابستہ

ہے۔ تو پھر کیوں اور کس طرح انسان اِس قسم کی اطاعت اور فرمانبرداری سے بری الذّمہ ہو سکتا ہے۔ اس جگہ پر پہنچکر سائنس کو بھی ضرورت مذہب تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ سائنس اور مذاہب کے قوانین گو مختلف ہوں۔ لیکن وہ ایکدوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ اور ان کا اجتماع محال نہیں۔ بلکہ ان دونوں کی غرض اور مقصد ایک ہی ہے۔ سائنس ان قوانین کو ظاہر کرتی ہے۔ جن کا تعلق ہماری مادی اور جسمانی فطرت سے ہے۔ اور اگر ہم ایک تندرست اور صحیح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہم کو چاہیئے کہ سائنس کے اخذ کردہ نتائج کی اطاعت کریں۔ اور مذہب ہم کو ان قوانین کی اطلاع دیتا ہے۔ جن کا تعلق ہماری رُوحانی اور اخلاقی زندگی سے ہے۔ اِنسانی سوسائٹی میں ہم اس وقت ترقی کر سکتے ہیں۔ جب اخلاقی رُوحانی جسمانی مادی سب کے سب قوانین کی پیروی کریں۔ بہر حالت میں اسلام یعنی قوانین کی فرمانبرداری کا اصُول ہمارے تمام افعال کا راہنما ہے +

ایک ایسا شخص ہی جس کو سائنس سے کوئی مناسبت نہیں اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے۔ اور مذہب سے بے پرواہ ہو سکتا ہے لیکن ذرا خیال تو کرو۔ کہ اگر دُنیا میں آج قوانین قدرت کی اطاعت

مفقود ہو جائے تو دُنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے سائنس کے اِن مادی قوانین کو معلوم کرنے سے ہمیں بیحد جسمانی ترقی اور آرام ملے ہیں تو کیا وہ قوانین جو ہم کو رُوحانی اور اخلاقی ترقی دلائیں اُن کا پتہ لگانا ہمارا فرض اور خواہش نہیں ہونا چاہیئے ۔ حالانکہ اگر ہم جسمانی ترقی کرتے گئے ۔ اور رُوحانی یا اخلاقی پہلو کی طرف توجہ نہ کی ۔ تو نتیجہ یہی ہوگا ۔ کہ ہمارے قوائے بہیمیہ ہم پر غالب آکر اُودھم مچائینگے ۔ نسل انسانی کو تباہ کردینگے ۔ موجودہ جنگ یورپ اس کی بہترین مثال ہے ۔ مذہب کو اس نظر سے دیکھنا جذبات کو شاید اپیل نہ کرے ۔ بلکہ بعض تو یہ کہیں گے ۔ کہ مذہب کو اس رنگ میں پیش کرنا مذہب کی ہتک کرنا ہے ۔ کیونکہ اس میں تو مقدس الہامی چیزوں کو معمولی انسانی سائنس کے برابر کردیا گیا ہے ۔ حالانکہ مذہب تو ان سفلی اشیاء سے بہت بالا اور برتر ہے ۔ مذہب میں تو عرفانِ الٰہی صفاتِ خدا اور اِنسان کے رُوحانی قوے وغیرہ کا ذکر ہونا چاہیئے جس سے ہم رُوحانی منازل یکے بعد دیگرے طے کرتے چلے جائیں ۔ یہ سب سچ ہے لیکن اس سے متذکرہ بالا بیان کی تغلیط تو نہیں ہوتی ۔ اور نہ مذہب کا کوئی خاص تفوق ثابت ہوتا ہے ۔ جو اعتراض کئے گئے ہیں ۔ وہ بظاہر معقول

ہوتے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں دوراندیشی اور حقیقت اشیاء پر غور کرنے کا کام نہیں لیا گیا۔ ہم کسی چیز کے وجود کو اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ اس کا اثر دوسروں پر نہ دیکھ لیں۔ قانونِ مناسبت ایک ایسا قانون ہے جو ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ اسی سے ہم دوسری اشیاء کی ماہیت معلوم کرتے ہیں۔ ہمارا علم ہرگز کامل نہیں۔ ہم کسی چیز کو صرف اس حد تک جانتے ہیں جس حد تک اس کا تعلق کسی دوسری چیزوں سے ہے۔ اور عرفانِ الٰہی بھی اسی قانون کے ماتحت آجاتا ہے۔ اول تو ہمارا علم ذات باریتعالیٰ کے متعلق بہت ہی قلیل ہے۔ اور صرف اسکی بعض ان صفات کا ایک محدود علم ہم کو ملا ہے۔ جن کا تعلق ہماری ذات یا ہماری دنیا سے ہے۔ اسکے علاوہ مقابلہ سے بھی ہمیں علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ہم کسی ایسی شئے کا خیال تک بھی کریں۔ جس کو ہماری شئے سے کوئی مطابقت اور مشابہت نہیں۔ لیس کمثلہٖ شیئًا (سورۃ الشوریٰ ورآیت)

ترجمہ۔ کوئی چیز اسکی مثال کی مانند بھی نہیں خدائے قدوس کی ذات اسقدر ارفع اور تمام مادی خیالات سے بالا ہے۔ کہ استعارے کے طور پر بھی اسکی مثل معلوم کرنا محال اور ناممکن ہے۔ اسکی ذات نہ صرف تمام مادی حدود اور قیود سے بالا ہے۔ بلکہ استعارہ اور مثل سے کہیں بلند ہے۔ ہم اپنے خیال میں اپنے علم کے موافق

یا قوم جس کے خیال میں خدا کی ذات اور صفات کا تصور بلند نقشہ سمایا ہو وہ ایک گھٹیا اور معمولی خدا کے آگے کس طرح جھک سکتی ہے

ہر ایک چیز کا تصوّر باندھتے ہیں۔ اور جو چیزیں ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہیں۔ ان کا بیان کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ بہر حال ہم چیزوں کی ہستی اور ان کے اثر سے اور ان کے صفات کو ملاحظہ کرنے کے بعد ان کی بابت کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں بعینہٖ یہی حالت ہے۔ جو کچھ بھی ہم کو خدا کی بابت سکھایا گیا ہے۔ اس کا تعلق ہماری ہی ذات سے ہے۔ اور ہماری تربیت اور قومی کا نشو ونما اسی علم پر منحصر ہے۔ خدا کی صفات کا علم ہی ہماری ضروریات زندگی میں بہت مدد دیتا ہے۔ اس سے وہ قوانین پیدا ہوتے ہیں جو نسل انسانی کی ترقی کے لئے ضروری ہیں وہ مذہب جو اس مقصد کے حصول سے ناکام رہے۔ وہ تو ایک خیالی چیز ہے جسمیں حقیقت کا نام بھی نہیں۔ اور وہ الہام جو انسان میں سیرت و سریرت کے جوہر پیدا کرنے کے لئے کوئی طریقہ بتائے اس کی حیثیت ایک قصہ یا ناول سے بڑھ کر نہیں ہوتی اخلاق اور روحانیت کوئی خیالی اختراع یا زبانی فسانہ نہیں۔ خود انسان کی جسمانی حالتیں جب ایک قاعدے کے ماتحت اور باقاعدگی کی حالت میں ہوں تو اخلاق بن جاتے ہیں۔ اور یہی اخلاق جب خاص قوانین

کے ماتحت اور بھی اعلےٰ ہو جاتے ہیں تو اُن کو رُوحانیت
کے نام سے موسُوم کیا جاتا ہے۔ الغرض یہی ذرات فضا
جو کائنات کو گھیرے ہوئے ہیں مختلف شکلوں میں اپنے
مقصد اعلیٰ کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اور ترقی کے مختلف
مدارج طے کرنے کے بعد زندگی کی شکل اختیار کرتے ہیں
حیوانات میں وہ ترقی پا کر احساس کی صُورت اختیار
کرتے ہیں احساس سے انسان میں آکر نُورِ قلب کی صُورت
اختیار کرتا ہے۔ اور نُورِ قلب مناسب ہدایات کے ماتحت
رُوحانیت کو پیدا کرتا ہے۔ جو زندگی بعد الموت کیلئے
بطورِ عمارت کے بن جاتی ہے۔ ترقی کی یہ مختلف منازل
جو ایک ذرّہ ناچیز کو رُوحانیت کے مرتبہ عظیم تک پہنچا دیتی
ہیں بہ الفاظ دیگر اس ذرّہ کی حیات اور ممات کا باعث
ہیں۔ یہ ذرّہ نہ فنا ہوتا ہے۔ اور نہ اپنے مقصد کو
نظروں سے نہاں ہونے دیتا ہے۔ بلکہ ہر ایک درجہ ایک
دوسرے درجہ کے لئے تیاری کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اور پہلے
سے اعلےٰ درجے کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔ جب مرحلہ
میں کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ تو اس پر موت ہوتی ہے۔
دوسرے درجہ کی زندگی بھی ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے
لیکن ساتھ ہی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن

اس تمام سفرِ ترقی میں ایک باقاعدگی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہر ایک جگہ کوئی نہ کوئی قانون جلوہ گر نظر آتا ہے۔ الغرض مادے کی تمام حالتوں میں اطاعتِ قوانین اور باقاعدگی نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں۔ تمام مادہ کسی نہ کسی مقرر طریق کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے معیّن راستوں پر چل رہا ہے۔ تو کس طرح ممکن ہے کہ انسانیّت کے درجۂ اعلےٰ پر پہنچ کر ان راہوں پر قدم مارنا چھوڑ دے۔ اس قسم کا اعتقاد رکھنا عین حماقت ہے۔ اور اپنی فطرت کو جھٹلانا ہے۔ اس بات سے انکار کرنا سراسر ہٹ دھرمی ہے۔ قوانین کی ضرورت ہمارے لئے مسلّم ہے۔ اور مذہب کی غرض و نمایت انہی مفید قوانین کو منوانا اور ان پر عمل کرانا ہے۔

## (۳) الہام ایک ضرورتِ حقّہ

الغرض مذہب و سائنس میں کوئی تضاد یا مخالفت نہیں۔ وہ حقائق اور معلومات جو انسانی محدود ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کو علوم سے نامزد کیا گیا ہے۔

اور اسی قسم کے حقائق جب ایک علیم و خبیر ہستی کی طرف سے خارق عادت طور پر نازل ہوتے ہیں۔ تو ان کو مذہب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسان اسی حالت میں اشرف المخلوقات ہونے کے دعوے کو نباہ سکتا ہے۔ جب اس کا علم بھی کافی و شافی ہو۔ خواہ اس علم کا ماخذ اسکی اپنی کوشش ہو یا خدا کی طرف سے بطور انعام ملا ہو۔ اور عام طور پر یہی ثابت ہوا ہے کہ پہلا ذریعہ یعنے انسانی کوشش کا نتیجہ ناقابل اعتبار اور پُر از خطرات ہے۔ کیونکہ اس راہ سے جو کچھ بھی ہم حاصل کرتے ہیں۔ وہ تکالیف اور ناکامیوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ بسا اوقات کمزور اور ناقص تجربات ہم کو غلط نتائج پر پہنچاتے ہیں اور مزید معلومات کے لئے انہی غلط نتائج کو ہم بنیادی اصول مان لیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ تھوڑی دُور چلکر ہمارے تجربے بے بنیاد اور غلط ثابت ہوتے ہیں۔ اور ہم کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ ادھوری معلومات اور ناقص علم جس پر ہم اس قدر نازاں ہیں ناکامیوں تکلیفوں اور نقصوں پر مبنی ہیں لیکن برخلاف اس کے اگر یہ مانا جائے کہ کائنات جس کا بہترین نمونہ انسان ہے۔ کسی ذہی فہم

ہستی کی مخلوق ہے۔ اور نیچر پر غور کرنے سے بھی یہی نظر آتا ہے۔ کہ ہر حصۂ قدرت میں ایک مقصد خاص نمایاں ہے۔ تو کیونکر ممکن ہے کہ خالق ارض وسما انسان کی نازیبا حرکات اور علم کا ناواجب اور غلط اِستعمال دیکھے اور چپکا بیٹھا رہے۔ ہر ایک اہلِ بصیرت یہی کہیگا کہ اِنسان کے اخلاق اور اس کی خواہشات کو راہِ راست پر لانے کے لئے خود خالق کی طرف سے ہدایت اور رہنمائی ہونی چاہئے۔ ورنہ وہ ربّ نہیں کہلا سکتا۔ کامل ربوبیت اسی حالت میں ہوگی۔ جب جسم کے علاوہ رُوحانی اور اخلاقی ترقی کا سامان بھی مُہیّا کرے +

میرے خیال میں تو یہ دوسری راہ پہلی سے نہ صرف زیادہ معقول ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی حکمت کے مناسب حال ہے۔ نیز فہم اور تمیز کے لئے ضبط اور قابو بھی ایک ضروری چیز ہے۔ اگر انسان کو نیک و بد دونوں کو اختیار کرنے کی طاقت دی گئی ہے۔ تو ضروری ہے کہ اسکو نیک و بد میں تمیز کرنے کی قوّت بھی دیجائے۔ تمیز اور علم کے بغیر اِس قسم کا اختیار تو ایک خطرناک بوجھ اور ایک ظالمانہ تحفہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی آدمی کو اُس کی قوّتِ اختیاری کے غلط استعمال کی وجہ سے سزا

دی جائے جبکہ وہ اپنی اِس قوّت پر قابو ہی نہیں رکھتا پس قوّت اختیاری کے عطا ہونے سے پہلے علمِ نیک و بد ملنا ضروری ہے۔ اور اگر اس قسم کا علم دیئے بغیر سزا دیجائے تو یہ عین ظلم اور ناانصافی ہے۔ ضروری تھا کہ حضرت آدمؑ کو حکم عدولی کی سزا میں باغ جنّت سے نکالنے سے پیشتر شجرِ ممنوعہ کے پاس جانے سے متنبّہ کر دیا جاتا۔ اِس حقیقت کو قرآن کریم مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کرتا ہے

"ما کنا معذّبین حتّٰی نبعث رسولاً"

یعنی خدا کسی کو بھی بغیر رسول اور نذیر بھیجنے کے سزا نہیں دیتا۔ اور جب ہم کو علم نیک و بد دیدیا جائے تو پھر اگر ہم نیکی کو چھوڑ کر بدی کی اتباع کریں تو ہم قابل سزا ہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ سیدھی اور آسان منطق سینٹ پال کے فہم رسا میں نہ آسکی۔ اور کلیسیا نے بھی اپنے بانی کی پیروی کرتے ہوئے اپنی اِس غلطی کو دُور کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان کے خیال میں قانون ایک لعنت تھی جس کا نتیجہ سوائے گناہ کے کچھ نہ تھا۔ اور اس واسطے نجات کا ذریعہ سوائے جناب مسیحؑ کے خونِ ناحق کے کوئی نہ رہا۔ ان کو اتنی سمجھ نہ آئی کہ قوانین سے گناہ پیدا نہیں ہوا کرتا بلکہ قوانین کی نافرمانی سے بدی کا درخت نشوونما پاتا ہے۔

قوانین کی پیروی نیکی اور فلاح کی راہ اور اُن کی نافرمانی جہنم کی سڑک ہے - اگر اختیار نیک و بد انسان کی فطرت میں ابتدا ہی سے پایا جاتا ہو تو ضروری ہے کہ علم نیک و بد بھی ازلی ہو - اور اگر قوت اختیاری خدا کیطرف سے بطور ہدیہ ملی ہے اور ہماری کسی کوشش کا نتیجہ نہیں تو علم نیک و بد بھی خدا کی طرف سے ملنا چاہئیے - کیا آپ صاحبان اسباب کو بیان کر سکتے ہیں - کہ خدا ئے خالق اسباب کو دیکھے کہ اسکی صنعت کا بہترین نمونہ یعنی انسان اپنے قوے کا غلط استعمال کرے - اور وہ انسان کی ہدایت کا کوئی انتظام نہ کرے - کیا کوئی باپ اپنے عزیز بچے کے ہاتھ میں ایک تیز چاقو اس حالت میں دیدیگا - جبکہ بچے کو اس چاقو کا ٹھیک استعمال نہ آتا ہو - اگر ہم ایسا کریں تو ہماری نیت کبھی نیک نہیں ہو سکتی - تو کیا یہی منطق ہم خدائے خالق اور مخلوق کے لئے استعمال نہیں کر سکتے - اگر آدم کو قوت تمیز دی گئی تھی تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا - کہ علم نیک و بد بھی ساتھ ہی دیا گیا ہوگا - اور اگر قوت اور اشیاء کے ٹھیک استعمال کا علم حاصل کرنا ان چیزوں پر قبضہ پانے سے پہلے ضروری ہے تو الہام کو بھی ایک انسانی معقولیت پر ضرور ماننا پڑیگا -

# (۴) الہام سالمات

اگر الہام اور وحی کا سب سے اعلےٰ مقصد نیک و بد میں تمیز کرانا اور جلبِ خیر اور دفع ضرر کے طریقوں سے عقل و فہم کو مدد دینا ہے۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا کائنات کا کوئی ذرہ بھی خواہ وہ زینہ ترقی کی کسی سیڑھی پر ہو۔ اِس رہنمائی سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اسی کا نام بعض نے قوّتِ نامیہ رکھا ہے جو ہر ایک نمو کی شکل میں خود بخود کام کر رہی ہے۔ اور دوست دشمن میں تمیز کر سکتی ہے۔ مادّہ اور طاقت کا یہ مجموعہ جس کو کائنات کہا جاتا ہے۔ اور جو اپنے مختلف اجزا کے لئے سامانِ زندگی مہیّا کرتا ہے۔ اسمیں اِس قسم کے عناصر بھی موجود ہیں جو فطرتی طور پر ایکدوسرے کی ہلاکت کا باعث ہیں۔ یا مادّے کے ہر ایک مرکب کے گرد اُس کے معاون یعنی ترقی دینے والے اسباب بھی ہیں۔ اور اس کی ترقی کے روکنے والے اسباب بھی موجود ہیں۔ گویا کہ دوستوں کا ایک ہجوم کثیر اس کے اِردگرد جمع ہے لیکن یہ مرکّب اپنے خیر خواہوں اور بدخواہوں میں خوب تمیز کر سکتا ہے۔ اور اپنے معاونوں کی طرف میلان اور دُشمنوں کی طرف سے اعراض اور نفرت کرتا ہے سائنس جو

چاہیئے اسکے وجوہ پیش کرے لیکن نقصان سے اعراض اور فائدہ
کی طرف میلان کرنے کی خاصیت مادے کے ہر مجموعہ اور
شکل میں موجود نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک بلور کا پتھر انہی چیزوں
کو اپنے ساتھ ملا لیگا۔ جو ترقی کرنے میں اس کے معاون و
مددگار ہوں۔ اور ان تمام چیزوں کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیگا۔
جو اس کے تنزل یا ہلاکت کا موجب ہوں۔ تاہم جاندار
چیزوں کا یہ حال نہیں بعض دفعہ مضر عناصر بھی انکے
اندر چلے جاتے ہیں لیکن اُن کو نکال دینے اور دُور کرنے
کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے۔ انسان جو مختلف قسم کے
فضلے باہر نکالتا ہے تو اُن کا بھی یہی مطلب ہے غیر ضروری
اور ضرر رساں اشیا کیلئے جسم انسانی میں کوئی جگہ نہیں
اُن کا باہر نکلنا ہی بہتر ہے۔ کھانے کے وقت اچھی بُری
سب قسم کی خوراک انسان کھا جاتا ہے۔ لیکن ہماری
خوردونوش میں صرف وہی چیزیں جسم کا حصہ بنتی ہیں
جو مفید ہوں۔ اور جسم انسانی کی پرورش اور نشو و نما
کے لئے ضروری ہوں۔ باقیماندہ فضلات کو غیر ضروری
اور ضرر رساں سمجھ کر نکال دیا جاتا ہے۔ فطرت حیوانی کچھ
اس قسم کی بنائی گئی ہے۔ کہ غیر مانوس اشیاء کے ساتھ ملکر
رہنا ہرگز گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اگر اُن اشیاء کو نکال دینا

اسکی طاقت سے باہر ہو تو وہ اسی اجنبی عنصر کے آگے سر جھکانے سے قطعی انکار کر دیتی ہے - اور اپنی ناپسندیدگی اور بغاوت بیماری کے رنگ میں ظاہر کر دیتی ہے - اور نتیجہ یہی ہوتا ہے - کہ کسی ڈاکٹر کے عمل جراحی یا جلاب کی مدد سے اس کی اجنبی اور غیر ضروری عنصر کو دور کر دیا جاتا ہے +

علاوہ ازیں ایک ہی قسم کے مادے سے شور - مرغی انسان سب پیدا ہوتے ہیں - انسان کے دماغ کا گودا انہی اجزا کا مرکب ہوتا ہے جن سے اُلو یا بندر کا دماغ بنتا ہے - ہاں اجزا کے تناسب میں فرق ہونے کی وجہ سے شکل اور قوے میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے - اور ایک کا دماغ دوسرے سے نہیں ملتا - ہر جگہ ایک ہی قسم کے مادہ اور قوت کا دور دورہ نظر آتا ہے - اور سب کی زندگی کا مدار ایک ہی قسم کے سامان پر ہے جہاں ذرا مقدار اور تناسب میں فرق ہوا - وہیں نتیجے میں بھی فرق آگیا - ایک ہی مادہ سے نیک یا بد نفع رساں یا ضرر رساں اسباب پیدا ہو سکتے ہیں - کوئی چیز بذات خود اپنے اندر کوئی خاص صفت نہیں رکھتی - نیک یا بد اچھا یا برا یہ تو لازم ملزوم اصطلاحیں ہیں - حالات اور مقدار کے موجب ایک چیز اچھی یا بری ہو سکتی ہے - ایک ہی چیز مختلف حالات

ہیں اور مختلف مقدار میں متضاد نتائج پیدا کر دیتی ہے۔
الغرض شکلوں یا قوی میں جو اختلاف نظر آتا ہے۔
اس کی وجہ ذرّات کا مختلف توازن اور مقداروں میں
جمع ہونا ہے۔ تمام کائنات میں دو ایسی خصوصیات نظر
آتی ہیں جو کبھی نہیں بدلتیں۔ اوّل تو یہ کہ ہر ایک ذرّہ ایک
خاص تناسب اور مقدار میں ایک خاص صفت اور قوّت کا
اظہار کرتا ہے۔ اور یہی ذرّہ جب ایک مختلف وزن یا مقدار
میں کسی دوسری چیز سے ملتا ہے تو اس کی صفات مختلف
ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمام ذرّاتِ عالم اور اُن کے
ان مجموعے و مُرکّب کی مُقررہ مقداروں اور حدود سے سرِ مُو
کم و بیش نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ان معیّن شرائط سے
تجاوز کرتے ہیں +

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس تناسب اور
مقدار کا مُقرر کرنا اور مادّہ کا ہر حالت میں ان حدُود کی
کی کامل اطاعت کرنا مادّے ہی کی ایک خاصیت ہے
یا اسکی وجہ کچھ اور ہے ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے۔ کہ
مادّہ قوّت حس کے آنے سے پہلے ہی اپنے افعال میں علم۔
دُور اندیشی اور فہم دکھاتا ہے۔ اگر مفید اشیاء کی طرف
میلان کرنا اور نقصان دہ چیزوں سے اعراض کرنا کسی

اندھی طاقت کا کام ہے۔ جس کو سائنس کی اصطلاح میں بالارادہ قوت نامیہ کہا جاتا ہے۔ تو پھر کیوں یہ میلان یا اعراض قوت حاسہ کے بڑھنے سے کم ہوتا چلا جاتا ہے کیا یہ تمام انتظام اور قواعد ایک ایسی ہستی کا پتہ نہیں دیتے جو بالارادہ ہے۔ اور جس نے اپنے فضل اور رحم سے ذرات عالم کو یہ وحی کی کہ وہ مقررہ راہوں پر چلے۔ تاکہ دوست دشمن میں تمیز ہوتی چلی جائے۔ ذرات کا ہر ایک مرکب ترقی کرنے کے لئے چند مقررہ قوانین پر چلتا ہے۔ اور اس اطاعت کی وجہ سے خود بخود مفید چیزوں کی طرف میلان اور نقصان دہ اشیا سے اعراض کرتا چلا جاتا ہے۔

## (۵) تناسب مقداری ارتقا کی جان ہے

کائنات عالم میں ایک مقدار اور توازن نظر آتا ہے ذرات فضا مختلف مقداروں میں مختلف صفات و قویٰ کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اُن کی آئندہ ترقی اور نشو و نما بھی مقررہ اندازوں اور نئے انتظامات کے ماتحت ہوتی ہے تناسب کے اختلاف ہی کی وجہ سے بعض مرکبات انتہا مفید اور بعض نقصان دہ ہوتے ہیں۔ غرض نقصان

اور فائدہ کا معیار صرف ذرّات کی مقدار پر منحصر ہے۔ مندرجہ ذیل صداقتیں جو نبی کریمؐ پر وحی کی شکل میں نازل ہوئیں اس مضمون پر خوب روشنی ڈالتی ہیں۔ ولقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ۔ سبح اسم ربك الذی اعلےٰ۔ الذی خلق فسوی۔ والذی قدر فھدی ....... ربنا الذی اعطےٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدی۔ (ترجمہ۔ اچھے اور برے کی مقدار اللہ تعالےٰ کیطرف سے ہے۔ اپنے اعلےٰ وارفع رب کے نام کی تسبیح کرو۔ جو چیزونکو مقدار کے مطابق پیدا کرتا ہے۔ اور پھر انکی ہدایت کرتا ہے۔ ہمارا ربّ وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی شکل اور مقدار عطا کی اور پھر ہدایت کی ....) یہ الفاظ کوئی گول مول یا مشتبہ نہیں۔ اور نہ ہی توضیح بیان کے لئے استعارے کا رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ اس واسطے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سائنس کی کسی تھیوری سے مطابقت دینے کے لئے ان الفاظ کی کوئی لمبی چوڑی تاویل کی گئی ہے یا کوئی من گھڑت معنے زبردستی چسپاں کئے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات قرآنی میں بڑے کھلے الفاظ میں اس صداقت کا اظہار کیا گیا۔ جن کو غلطی سے جدید سائنس کی دریافت مانا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں سے آخری آیت یعنے ربنا الذی اعطےٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدی بڑے واضح الفاظ

میں اس اصول کو بیان کرتی ہے۔جس کو سائنسدان بلا ارادہ قوتِ نامیہ کہتے ہیں +

میں نے ان آیات کو لفظاً لفظاً درج کیا ہے کیونکہ ان کا ہر ایک لفظ اپنے اندر صداقت لئے ہوئے ہے۔اور میرے خیال میں ان لغوی معنوں کے بیان کرنے سے معاملہ اور بھی صاف ہو جائیگا۔لفظ ربّ جس کا ترجمہ مالک یا مالک کیا جاتا ہے۔اس کا مفہوم امام راغب اپنی تصنیف مفرداتِ راغب اصفہانی میں یوں بیان کرتے ہیں ربّ وہ ہے جو ایک چیز کی پرورش اس طرز سے کرے۔کہ وہ ترقی کے درجے بعد دیگرے طے کرتی ہوئی کمال تک پہنچ جائے۔ پس لفظ ربّ کے استعمال سے پتہ لگتا ہے۔کہ ہر ایک چیز اس طرز پر بنائی گئی ہے۔کہ اپنی استعداد اور حدود کے مطابق وہ کمال کو آہستہ آہستہ حاصل کرے۔اور درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی تکمیل کو پہنچ جائے۔لفظ ربّ میں نہ صرف پیدا کرنے اور پرورش کرنے کی صفات کا ظہور ہے بلکہ تربیت دینے اور کمال تک پہنچا دینے کا کام بھی ربوبیت ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔اور خدا کی یہ صفت ذراتِ عالم کی ادنےٰ سے لیکر اعلےٰ تک سب حالتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے خلق کا ترجمہ عموماً پیدا کرنا کیا جاتا ہے۔لیکن اگر آپ کسی

مستند اور معتبر لغات مثلاً لسان العرب کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ لفظ خلق کے اصلی معنی توازن ہیں۔ اور اسی طرح اس کے معنی مادہ کو شکل دینا اور چیزوں کا بنانا ہو گیا ہے خالقیت کا مفہوم سمجھانے کے لئے زبانِ عربی میں ایک اور لفظ فطر بھی ہے۔ جس کے معنی نیستی سے ہستی کرنا ہے۔ یہی دو الفاظ ساری دنیا کی خلق اور بناوٹ سمجھانے کیلئے کافی ہیں۔ پہلا فعل صفت فاطر یعنی نیستی سے ہستی کرنا ہے اور جب ایک چیز پیدا ہو گئی تو صفت خلق نے اپنا ظہور دکھا کر ان کا توازن کیا اور مختلف شکلوں میں اُن کے مرکب بنا دیئے۔ یہی تناسب اور توازن کا انتظام مختلف مقداروں میں فائدہ اور نقصان پیدا کرتے ہیں۔ تمام خلق اور ارتقا کا دار و مدار مقدار اور توازن پر ہی ہے اور یہی عربی لفظ خلق کے معنی ہیں +

قرآن کریم نے خلق کے بعد سوی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سوّا کے معنی ہیں توازن و مساوات قائم کرنا اور فعل خلق کے بعد فعل سوّا یعنی توازن کا قائم کرنا ضروری ہے +

دوسری آیت میں دو نئے لفظ استعمال ہوتے ہیں قدر و فھدیٰ۔ قدر کے معنی مقدار مقرر کرنا ہے۔ قرآن کریم

میں لفظ قدر بارہا خیر و شر کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اور اس میں بھی یہی اشارہ ہے۔ کہ تمام نیک و بد ایک ہی چیز کے مختلف تناسب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لفظ ھدیٰ وحس کے معنے مقصد اعلیٰ تک رہنمائی کرنا ہے معاملہ کو اور بھی صاف کرتا ہے۔ خدا نہ صرف مادہ کی خلقت اور توازن کرتا ہے۔ بلکہ ہر چیز کمال تک پہنچنے کے لئے رہبری کی محتاج تھی۔ اور قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ ہم نے ان کو یہ رہبری عطا کی ہے۔ الغرض ان مختصر لیکن جامع الفاظ میں صحیفہ اسلامی تمام کائنات کی خلق کا فلسفہ بیان کر دیتا ہے۔ پہلے پہل تو ایک بالارادہ ہستی کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا نام ربّ یعنی خالق پرورش کنندہ ترقی دہندہ رکھا ہے۔ اور جو خلق کے بعد مادہ کو مختلف مقداروں میں جمع کرتا ہے۔ تاکہ مختلف نتائج مُرتّب ہوں وہ نہ صرف نیستی سے ہستی میں لاتا ہے۔ بلکہ اُن کو تکمیل تک بھی پہنچاتا ہے۔ اور ہر ایک کی ترقی کے اسباب پیدا کر کے ان کو صراط مستقیم دکھاتا ہے اس ذاتِ باری نے مادّہ کی ہر ایک شکل میں فطرتی طور پر ایک مقررہ راہ پر چلنے کی استعداد پیدا کر دی ہے۔ جب ذرّاتِ عالم مختلف شکلوں میں متشکل ہو گئے تو اس کے بعد اُن کی مزید ترقی یا تکمیل کا دارومدار اُن کی نئی تنظیم و ترتیب پر رکھا۔ تاکہ

وہ حالات کے مطابق مفید یا مضر بن جائیں چنانچہ وہ مختلف مقداروں میں ڈھالے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح منازل ارتقا طے کرتے رہتے ہیں +

اب یہ فیصلہ کرنا کہ یہ عربی الفاظ جو علم سائنس کے رموز سے معمور ہیں۔ انکے معنے عربوں نے علم سائنس کی تصویرونکی توسیع کے بعد ان پر چسپاں کئے یا زمانۂ سلف ہی سے یعنی زمانہ جاہلیت میں پیشتر از اسلام یہی مفہوم ان لفظوں کے سمجھے جاتے تھے۔ اور اگر اس دوسری بات کو تسلیم کیا جائے تو ہم کو ماننا پڑیگا۔ کہ یا تو زمانۂ قدیم میں عربوں کا علم سائنس بہت وسیع تھا اور یا جیسا کہ میرا ایمان ہے عربی زبان اُمُّ الالسنہ اور الہامی زبان ہے اور اسی وجہ سے اسکے الفاظ کے اندر وہ معنی اور رموز رکھے گئے تھے جو توسیع علوم کے بعد کبھی ظاہر ہونے تھے تاہم کچھ بھی ہو۔ میرے مضمون کو ان سوالات سے چنداں تعلق نہیں۔ اور طول مضمون کے ڈر سے میں فی الحال ان کے متعلق کچھ نہیں لکھتا لیکن بہر حال یہ بات تو اظہر من الشمس ہے۔ کہ قرآن کے نازل ہونے کے ساتھ ہی لوگوں کے دلوں میں توسیع علوم کا ایک جوش سا پیدا ہو گیا اور اس صحیفۂ آسمانی نے کئی سربستہ صداقتوں کو صاف

کر دیا اور اپنے پڑھنے والوں کو صراط مستقیم پر چلا کر فلاح کی کی منزل مقصود پر پہنچا دیا +

الغرض سالمات ایک مقررہ راستے پر قدم مار رہے ہیں ان میں فطرتی طور پر نیک و بد میں تمیز کی قوت رکھی گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی اور ترقی کے لئے مادہ میں انتخاب کرتے ہیں۔ اور خدا داد خواص کے بموجب معین راہوں پر چلتے ہیں۔ اور اس فعل ربانی کا نام ہم بجا طور پر سالمات کو وحی کے نام سے پکار سکتے ہیں +

ربنا الذی اعطا کل شیٍ خلقہ ثم ھدیٰ (القرآن)

## (۶) اخلاق توازن جذبات کا نام ہے

الرحمٰن ۰ علم القراٰن ۰ خلق الانسان علمہ البیان ۰ الشمس والقمر بحسبانٍ ۰ والنجم والشجر یسجدان والسماء رفعھا ووضع المیزان ۰ الا تطغوا فی المیزان ۰ واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان (سورۃ الرحمٰن آیت ۱ تا ۹)

ترجمہ الرحمٰن (خدا) نے قرآن (جیسی فائدہ مند کتاب کو) سکھایا۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اس کو بولنا سکھایا ہو۔ سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ (گردش میں)

ہیں (تمام) بوٹیاں اور درخت (اس کی درگاہ میں) سربسجود
ہیں۔ اس نے آسمان کو اونچا کیا۔ اور اس نے توازن
قائم کئے تاکہ لوگ بھی وزن میں تجاوز نہ کریں۔ اور انصاف
کے ساتھ توازن کو قائم رکھیں۔ اور اسمیں کمی بیشی نہ کریں +
مندرجہ بالا صداقت ہم قرآن شریف کی سورۂ الرحمٰن
کی پہلی چند آیات میں پاتے ہیں۔ ان آیات میں ہمارا
علیم خبیر خدا ہم کو ضرورت الہام کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور
ان الفاظ میں جو علم سائنس کی معلومات سے لبریز ہیں۔
غیبی رہنمائی کی حاجت بیان کرتا ہے۔ ان میں اسی توازن
کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو مادہ کی ہر شکل میں عالمگیر
طور پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک ذرہ ناچیز اور ادنےٰ
سے ادنےٰ جڑی بوٹی سے لے کر آفتاب عالمتاب اور دیگر اجرام
فلکی تک سب مخلوقات قوانین کی پیروی کرتی ہوئی نظر آتی
ہے۔ اور جو توازن اسکی تربیت اور حیات کیلئے مقرر ہے اس پر
عمل پیرا ہے۔ اور تو اور نطق انسانی بھی اس کے خلاف
ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ کلام کیا ہے آواز کی اونچ نیچ یا
توازن۔ ہوا کی کمی بیشی ہی سے مختلف الفاظ پیدا ہوتے
ہیں۔ اور اسی اونچ نیچ کے متعدد مجموعوں سے مختلف الفاظ
بنتے ہیں۔ اور کسی زبان کے سیکھنے کے لئے ہم ان مختلف

مجموعوں کے مقرر کردہ معانی اور ان کی شکلیں یاد کرتے ہیں
قرآن شریف بھی اپنے پڑھنے والوں کی توجّہ اسی بنیادی
اصول کی طرف مبذول کرتا ہے۔ جو عالم کے ہر گوشے
میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ہمارے چاروں طرف
ہر چیز حتّٰے کہ ہماری گویائی بھی ایک مقررہ توازن کے
ماتحت ترقی پاتی ہے۔ تو کیا خود انسان کو اسباب کی اشد
ضرورت نہیں۔ کہ اس کے پاس کوئی ایسا توازن اور معیار
ہو جو اس کے فطرتی جذبات کو قابو میں رکھے۔ اور اُن کو
صراط مستقیم پر چلا کر مذہب فلسفہ اور اخلاق کے عرش بریں
تک پہنچا دے۔ جسم انسانی بھی تو ذرات کا ایک خاص
مجموعہ ہے۔ جس کا نتیجہ ضمیر اور قوت مُمیّزہ کو خُوب ترقی
دینا اور جذبات کا پیدا کرنا ہے یہی خواہشات اور جذبات
اگر ان کو حدُود کے اندر ٹھیک راہ پر چلا یا جائے تو انہی
کا نام محاسن اخلاقی ہو جاتا ہے۔ اور جب اِن اخلاقی
خوبیوں کا توازن بڑے احسن اور بہترین طور پر ہو تو اسی کو
رُوحانیت کے نام سے موسُوم کر دیا جاتا ہے۔ اب ہم کو
یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ وہ توازن اور معیار جو اِنہی نفسانی
خواہشات کو کیمیا گر کی چھو کی طرح اخلاق اور رُوحانیت
کے مسند اعلےٰ پر بٹھا دیتے ہیں۔ اور حیوانی قوّتِ حاسہ کو

ضمیر اور قوتِ ممیزہ جیسے نعمت سے بدل دیتے ہیں وہ کیا
ہیں۔ اور ان کو کس نے بنایا۔ یہ الفاظِ قرآنی وضع المیزان
الا تطغوا فی المیزان ۰ واقیموا الوزن بالقسط ولا
تخسروا المیزان (ترجمہ۔ اس (رحمٰن خدا) نے توازن قائم
کیئے تاکہ لوگ بھی وزن میں تجاوز نہ کریں۔ اور انصاف
کے ساتھ توازن کو قائم رکھیں اور اسمیں کمی بیشی نہ کریں)
پس معلوم ہُوا کہ ہمارے لئے ظلم اور عدوان سے بچنے کے لئے
اور انصاف قائم رکھنے کے لئے اس معیار اور توازن
کا جاننا اور سمجھنا اشد ضروری ہے۔ جیسا کہ آگے بھی میں
نے جسمانی دُنیا کی مثالیں دیکر ثابت کیا۔ کہ کوئی چیز بھی
بذاتِ خود نیک یا بد نہیں۔ اعلیٰ اخلاق خواہشات اور
جذبات کو بالکل مار ڈالنے کا نام نہیں بلکہ خوبی اور فائدہ والی
بات تو یہ ہے کہ انہی جذبات کو ٹھیک راہ پر لگایا جائے۔
تاکہ اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں اور رُوحانیت جیسی نعمتِ
عظمیٰ حاصل ہو۔ تمام وہ مذاہب جن کی بُنیاد رُہبانیت
یعنی جذباتِ انسانی کو ہلاک کرنا ہے ناکامیاب ثابت ہُوئے
کوئی انسان بھی بُدھ مت کے اصُولہائے زندگی پر عمل پیرا
نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح حضرت مسیحؑ کا پہاڑی والا وعظ
بھی آج تک لفظی شکل ہی میں رہا۔ اور کسی نے اُس کو

عملی جامہ نہ پہنایا۔ یہ کیوں؟ اس واسطے کہ یہ ہماری فطرت سے خلاف ہے۔ ایک دریا کی روانی کو بالکل روک دینے کی کوشش کرنا فضول ہے بہتر ہے کہ اس کی پانی کی رَو کو بدل کر یعنی نہروں وغیرہ میں ڈالکر کھیتوں کو سیراب کیا جائے۔ نفس کشی اور رہبانیت کسی رنگ میں بھی ہو اُس کا نقصان اُس کے فائدے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اُن پر عمل کرنا گویا ایک فطرتی تقاضا سے اعراض کرنا بلکہ اسکے خلاف کرنا ہے۔ اور اسی واسطے اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے سے جو ناگفتہ بہ اخلاقی گند پیدا ہوتے ہیں وہ کسی سے نہاں نہیں۔ اور یہ سہرا قرآن کریم ہی کے سر ہے۔ کہ وہ سب سے پہلے یہ صداقت دُنیا میں لایا۔ اس نے بتایا کہ فطرتی جذبات کا اظہار بھی قلب انسانی کی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ ہاں اِس اظہار کے لئے معیار اور توازن ہونی چاہئیے۔ جب دُنیا میں ہر ایک چیز مقررہ قوانین کے ماتحت کام کرتی نظر آتی ہے۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ اشرف المخلوقات کی اشد ضروریات کے لئے کوئی مقررہ معیار اور توازن نہ ہو حقیقی انسانیت کو ترقی دینے کے لئے لازمی تھا۔ کہ جذبات انسانی کا لحاظ رکھا جائے۔ اور مقررہ معیار کے بموجب ان کا توازن کیا جائے۔

رحم جیسی صفت پسندیدہ کو اگر بیمحل استعمال کیا جائے تو وہ ظلم و ناانصافی سے بدتر ہے۔ اور غصّہ و سزا کا بھی ٹھیک انداز سے اظہار کیا جائے تو اس سے امن اور انتظام قائم ہوتا ہے۔ اور حیاتِ عمرانی کو مدد ملتی ہے۔ یہ تمام کچہریاں اور پولیس کا محکمہ کیا ہے۔ غصّہ اور سزا کا ایک ٹھیک انداز سے اظہار اور اگر سنگین مجرموں اور قاتلوں پر رحم کر کے ان کو آزاد کر دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ امن اٹھ جائیگا۔ اور حیاتِ عمرانی کی ترقی بالکل رک جاویگی۔ الغرض اخلاقی دنیا میں بھی توازن اور معیار کا قانون ہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ جس طرح جسمانی دنیا میں ایک ہی مادہ کی مختلف نسبتیں مختلف شکلیں اور نتیجۃً مختلف وصفات و خصوصیات پیدا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ایک ہی قسم کے جذبات اور خواہشات کا مختلف توازن اور تناسب مختلف اخلاق پیدا کر دیتا ہے۔ جن میں سے بعض اچھے اور بعض برے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہی جذبہ کو حالات کے مختلف سانچوں میں ڈھالو تو ہر دفعہ اس کا ایک نیا نام رکھنا ہوگا۔ ایک ہی جذبہ اگر ایک شکل میں بڑا اعلےٰ اور قابلِ تحسین ہے۔ تو وہی اگر دوسری شکل میں کریہ اور قابلِ نفرین نظر آتا ہے۔ حالات کے

بدلنے سے اُسکی ساری قباحتیں خُوبیاں بن جاتی ہیں۔ کیا بات پر اَڑنا۔ ضد کرنا۔ کسی کی نہ سُننا۔ اپنی ہی کرنا یا یہ الفاظِ دیگر مُستقل مزاجی اور اُولعزمی یہ جب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ تو اِنہی کا اِظہار جب کمال تک پُہنچ جاتا ہے۔ تو ایک طرف آدم علیہ السلام یا اِنسانِ کامل اور دوسری طرف شیطان الرجیم کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔ اِسی طرح اطاعت اور غلامی۔ حیا اور بُزدلی۔ بُردباری اور دیوثی۔ اظہار شجاعت اور شیخی۔ سخاوت اور فضول خرچی۔ رشک اور حسد خواہشِ ترقی اور لالچ۔ خواہش اور طمع وغیرہ وغیرہ کیا ان سب کا آغاز اور اصلیت ایک ہی جذبہ کو دو مختلف لباس پہناتا نہیں۔ ذراتِ مادہ کو جسمِ اِنسانی میں ترقی دینے سے قوتِ حِس پیدا ہُوئی۔ اور اِنسان کیا ہے چند جذبات اور خواہشات کا مجمُوعہ جن میں سے اکثر حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہر ایک خواہش اگر اس کا مُقررہ معیار اور حدُود کے اندر اِظہار کیا جائے۔ تو نتیجہ اچھّا اور حسب دلخواہ ہوتا ہے۔ اور نیک اور بھلے ہونے کا سرٹیفکیٹ اس کو مِلجاتا ہے۔ اس معیار کو جو عام طور پر مقام وسطی پر ہوتا ہے قائم کرنا مذہب اور اخلاق کا فرض ہے۔ ذرا ان حدُود سے باہر قدم رکھو تو نیکیوں کی ضَو گناہ اور جُرم کی ظلمت

سے مُبدّل ہو جاتی ہے۔ بدی دُنیا میں بذاتِ خود کوئی ہستی نہیں۔ اور وہ مذہب جو ایسا کہتا ہے بالکُل باطل ہے گُناہ ہرگز کسی چیز کی فطرت میں نہیں ہماری جسمانی تربیت کے لئے جس خوراک کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اسکو بیجا طور پر استعمال کریں تو نتیجہ بیماری اور ہلاکت ہوتا ہے۔ اسیطرح جب ہم اخلاقی غذا کو بیجا طور پر کام میں لائیں تو وہ بدی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہر بات میں درمیانی اور بین بین رستہ صراط مستقیم ہی اختیار کرنا چاہیئے یقیناً افراط و تفریط کا نتیجہ گُناہ اور بدی ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا راہِ وسطیٰ پر چلنا ہی کامیابی اور فلاح کو پانا ہے۔ اسبارے میں میرا دل چاہتا ہے کہ میں زبانِ عربی کے محاسن کی طرف اشارہ کرکے دکھاؤں کہ اِس اُمُّ الالسنہ نے کونسا لفظ بدی کا مفہُوم ادا کرنے کیلئے اِنتخاب کیا ہے۔ بدی اور گُناہ کے لئے جس قدر الفاظ بھی آپ زبان عربی میں پائیں گے ان سب کے اصلی معنی زیادتی اور حدُود سے تجاوز کرنا ہونگے۔ مثلاً ذنب۔ جُرم جُناح۔ اثم۔ لفظ ذنب کے معنی زیادہ بڑھنا ہے۔ یعنی وہ جو خاص حدُود سے تجاوز کرے۔ جیسا کہ جانوروں کی دُم کے لئے اس لفظ کا اِستعمال ہونا بتاتا ہے۔ جُرم کے معنے

کاٹنا یا وہ چیز جو کاٹی جائے یعنی غیر محل ہو جُناح کے معنی ایک طرف ہونا علیحدہ ہونا۔ الغرض قرآن نے جس قدر الفاظ لفظ گناہ کے مترادف معنوں میں استعمال کیئے ہیں۔ اُن کے مادّی اور لغوی معنے ہیں حدُود سے آگے بڑھنا اور زیادتی کے معنے ضرور پائے جاتے ہیں۔ گویا کہ تمام بدی اور گُناہ کا فلسفہ لفظ کے معنی ہی میں بیان کردیا ہے اس کے سمجھنے کیلئے ہم کو کسی عالم یا فاضل یا فلاسفر کی مدد کی ضرورت نہیں صرف کسی لغت کی کتاب میں ان لفظوں کے مادّے اور لغوی معنے پڑھ لینا کافی ہے +

لفظ توبہ جو ایک اور عربی لفظ ہے ساری توبہ کی حقیقت اپنے معنوں کے اندر لئے ہُوئے ہے۔ اس کے معنے واپس آنا۔ اگر حدُود سے بڑھنا گُناہ ہے تو یقینی واپس آنا ہی توبہ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح عربی لفظ وسط کے معنے درمیانی بھی اور اعلےٰ و بہترین بھی ہیں۔ کیونکہ درمیانی چیز عموماً بہترین ہوتی ہے +

پس ثابت ہوا کہ جسمانی دُنیا کی طرح رُوحانی دُنیا میں بھی کوئی چیز بذاتِ خُود اچھی بُری نہیں۔ حدُود کی نگاہداشت کرنا ہی نیکی ہے۔ اور ان سے تجاوز کرنا گُناہ ہے۔ ہر ایک جذبہ خواہ درشت ہو یا نرم اگر حدود کے اندر پُورا کیا جائے

تو اعلیٰ اخلاق کا منبع بن سکتا ہے۔ قانون دانی کیا ہے حدود مقرر کرنا لیکن سچی اور ٹھیک حدود وہ ہستی مقرر کر سکتی ہے جو علیم خبیر ہو۔ قرآن شریف نے اعمال صالحہ کا نام خدا کی حدود کو قائم کرنا لکھا ہے۔ فرمایا:۔

التائبون العبدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المومنین (سورۃ البراۃ آیت ۱۱۲) **ترجمہ** (وہ جو توبہ کرنیوالے ہیں۔ عبادت کرنیوالے حمد کرنیوالے۔ روزے رکھنے والے۔ رکوع و سجود کرنیوالے ہیں جو نیکی کی تحریص اور بدی سے روکتے ہیں۔ اور جو اللہ کی حدود کو قائم کرتے ہیں۔ اور مومنوں کو خوشخبری دو) ایک اور جگہ فرمایا "اور یہ اللہ کی حدود ہیں جو کوئی ان سے تجاوز کریگا وہ اپنے ہی نفس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور حدود کی نگاہداشت کرنے کا حکم قرآن کریم نے بار بار فرمایا ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم ...... تلک حدود اللہ .... ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ ...... ولہ عذاب مھین (سورۃ النسا آیت ۱۱ تا ۱۴) (ترجمہ۔ اللہ تم کو تمہاری اولاد کی بابت حکم دیتا ہے ..... یہ اللہ کی (قائم کی ہوئی) حدود ہیں .... اور جو

کوئی اللہ اور اس کے رسُول کی مخالفت کرتا ہے اور اسکی (قائم کردہ) حدُود سے تجاوز کرتا ہے ... ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے) پھر سُورہ بقرہ میں فرمایا۔ فمن اعتدیٰ بعد ذٰلک فلہٗ عذاب علیم (ترجمہ۔ جو کوئی اس کے بعد (حدود سے) تجاوز کریگا۔ اسکو سخت سزا ہوگی) پھر اسی سُورۃ کے ذرا آگے چلکر فرمایا۔ ولا تعتدون ان اللہ لا یحب المعتدین (ترجمہ۔ حدود سے تجاوز مت کرو۔ اللہ زیادتی کرنیوالوں سے محبّت نہیں کرتا) پھر سُورۃ البرأت میں فرمایا۔ الاعراب اشد کفرا و نفاقا و اجدر الا یعلمو حدود ما انزل اللہ علی رسولہ۔ ترجمہ۔ اور بدو لوگ کفر اور نفاق میں بڑے سخت ہیں اور اللہ نے جو حدُود اپنے رسول پر نازل کیں انکو نہیں مانتے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا۔ تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا (ترجمہ۔ یہ اللہ کی (قائم کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز مت کرو+

# رُوح

## اُسکی پیدائش اور فرائض

زندگی کی ابتدا کیونکر ہوتی ہے؟ اور مادہ میں رُوح کا

ظہور کس طرح ہوتا ہے؟ یہ مسائل ابھی تک معمّے ہیں جن کو عقل انسانی حل نہیں کر سکی ۔ علوم طبعیات بھی اس عمل زندگی کی کوئی معقول تشریح کرنے سے ابھی تک قاصر ہیں۔ اور اس عقدہ کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے ۔ کہ زندگی کا یہ عجیب وغریب عمل جو دفعتہً ظہور پذیر ہوتا ہے کیونکر صادر ہوتا ہے مگر چونکہ بادی النظر میں رُوح اور مادہ میں ایک اختلاف نظر آتا ہے اسلئے بعض محققین رُوح اور مادّہ کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ رُوح جب اپنے پُورے کمال کو پہنچتی ہے تو جسم انسانی پر حکومت کرتی ہے ۔ اس لئے یہ استدلال کیا جاتا ہے ۔ کہ رُوح جسم سے الگ ایک چیز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حیات کی وہ لہر بھی جسے زندگی کہتے ہیں ہر ایک جسم میں یہی عمل کرتی ہے ۔ تو زندگی بھی مُردہ مادّے کو کامل طور پر اپنے ماتحت کر لیتی ہے ۔ زندگی کا جب ظہور ہوتا ہے ۔ تو وہ جسم کی ہر ایک چیز پر مسلّط ہو کر اس کی منتظم بن جاتی ہے ۔ لیکن یہ زندگی پھر رُوح کے ماتحت کام کرتی ہے ۔ اس لئے اگر کوئی شخص رُوح اور جسم کو علیحدہ علیحدہ مانتا ہے ۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ رُوح باہر سے آتی ہے ۔ تو دوسرے لوگ یہی دلیل زندگی کے متعلق پیش کر دیتے ہیں ۔ تاہم بعض حلقوں میں اگر اس قسم کا

استدلال تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مادّہ دفعتہً ایک مُردہ اور بیجان حالت میں سے جاندار اور متحرک ہوجاتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ رشتہ حیات جو دفعتہً ظاہر ہوتا ہے اسی مادہ میں سے نکلتا ہے جس پر وہ حکومت کرتا ہے۔ اسلئے مذکورہ بالا توجیہ کو بلا تامل تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نکتہ کو حل کرنے کے لئے بجلی کی پیدائش بہترین مثال ہوسکتی ہے۔ بجلی بھی جبکہ دو دھاتیں اور ایک مایہ چیز جمع کیجائے تو فوراً ہی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور جوں ہی یہ پیدا ہوتی ہے فوراً ان ہی اشیاء پر اپنا تسلط جما لیتی ہے۔ جن سے وہ پیدا ہوئی ہے۔ اس قدرتی نظارہ سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ بعض اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں جو بلحاظ شکل و صورت اور خصوصیات کے اپنے اجزاء ترکیبی سے مختلف ہوتی ہیں۔ مگر تاہم وہ ان ہی اجزا میں سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اور باہر سے نہیں آتیں +

اس کے علاوہ عالم ارتقاء کے تمام منازل و مراحل پر ایک اور نظارہ دیکھتے ہیں۔ ہر ایک جسم نہ صرف اپنی پرورش کیلئے اپنے سے کمتر ہستی سے خراج وصول کرتا ہے بلکہ اس پر ایک گونہ تفوقانہ حکومت بھی کرتا ہے۔ کوئی جسم

جب دو ارتقائی مراحل کے درمیان واقع ہوتا ہے تو جو مرحلہ اس سے نیچے ہے اس سے اپنا سامانِ حیات حاصل کرتا ہے۔ اور اس پر حکومت کرتا ہے لیکن خود اپنے سے اعلےٰ مرحلہ کی حکومت کو برداشت کرنے کا شائق بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اس دُنیا میں ہر ایک جاندار چیز بیجان اشیاء سے فائدہ اٹھاتی ہے اور ان پر حکومت کرتی ہے۔ اور جب یہ سلسلۂ حیات حیوانات کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس میں مختلف جذبات و حسّیات پیدا ہوتے ہیں۔ اور عملی طور پر یہ جذبات ہی زندگی کی مشین پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اور اسی حکومت کے اشاروں سے بقائے حیات کے لئے دوسرے کمتر درجہ کی حیوانی زندگیوں کو نیست و نابود کیا جاتا ہے یہی حسّیات جب ابتدائی مرحلہ پر بعض قیود و فرائض کے اندر جکڑی جاتی ہیں تو جسم انسانی کے جذبات بن جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد پھر ارتقائی منازل کو طے کر کے وہ اعلےٰ چیز بن جاتے ہیں۔ جن کو رُوح کہا جاتا ہے۔ غرض رُوح اِس طرح پیدا ہو کر جذبات و حسّیات پر حکومت حاصل کر لیتی ہے۔ اور جذبات و حسّیات دوسری اشیاء پر حکومت کرتے ہیں +

چند جاندار چیزوں کی ارتقائی ترقی کو دیکھ کر اور ان کے ظاہری اختلاف و تباین کو ملاحظہ کر کے جو ان کی خصوصیات اور شکل و شباہت میں نظر آتا ہے جلدی سے یہ نتیجہ تو نکالا جا سکتا ہے کہ کسی مرحلہ پر کوئی نئی چیز ان کی فطرت میں داخل ہو گئی۔ جو پہلے ان میں موجود نہ تھی۔ مگر یہ نتیجہ ہماری ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اور یہ اُمید کیجاتی ہے کہ آیندہ نسلیں علوم طبعیات میں اس قدر ترقی کرینگی کہ وہ اس معمہ کی عقدہ کشائی کر سکیں +

مادّہ اپنے دوران ترقی میں جب ایک خاص مرحلہ پر پہنچتا ہے۔ تو اس میں نئی خصوصیتیں اور خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ زندگی۔ قوّت حسّی۔ جذبات تمیز و عقل یا رُوح یہ سب ایک ہی مرحلہ کے مختلف نام ہیں۔ اور خواہ ان کا ظہور دفعتہً ہو اور اس کے علوم طبعیات اُن کی تشریح نہ کر سکیں۔ لیکن تاہم وہ اسی مادّہ سے ترقی کر کے بنتے ہیں۔ اگر ہم زندگی یا رُوح کو جسم میں سے پیدا ہوا نہ مانیں بلکہ ان کا باہر سے آنا تسلیم کریں۔ تو پھر ان حسیات کے متعلق کیا کہینگے جو حیوانات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بھی تو آخر بلحاظ اپنی خصوصیتوں کے مادہ اور زندگی سے مختلف ہوتی ہیں

اور زندگی پر حکومت کرتی اور اس کے فرائض میں اُسے مدد دیتی ہیں۔ کیا اُن کے متعلق بھی یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی باہر آئی ہیں؟ کیونکہ ان میں بھی وہی باتیں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہم نے یہ تسلیم کی ہے کہ زندگی اور رُوح جسم میں سے ہیں۔ بلکہ باہر سے آتی ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا +

جذبات و حسیات کے متعلق ہمیشہ یہی خیال کیا گیا ہے کہ وہ جسم میں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جذباتِ حیوانی اور جذباتِ انسانی میں محض درجوں کا فرق ہے۔ ورنہ فطرتاً وہ ایک ہی جوہر کے ہیں۔ قلبِ انسانی میں قدرتی حسیات کے ساتھ شعورِ نفس بھی پیدا ہوا ہے۔ اور کیا یہی شعورِ نفس اس تمیزِ انسانی کا ہیولیٰ نہیں جس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ رُوح کی اصل خاصیت ہے؟ اگر قوتِ تمیز کی اصلی شعورِ نفس ہے جو تمام جذباتِ انسانی کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ اور اگر یہ [illegible] جذبات بھی حیوانی حسیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر کیا [illegible] جسم سے رُوح پیدا نہیں ہوتی؟

## رُوح ایک باشعور قوتِ نامیہ ہے

جسمِ انسانی میں جو کام رُوح کرتی ہے۔ اس سے بھی ہم اسی

نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ روح اِنسانی...... کی راہ میں جب خواہشاتِ رذیلہ نہ ہوں تو اس کا کام صرف یہی ہے کہ ہم میں جذباتِ اسفل سے اعلےٰ اخلاق اور اعلےٰ اخلاق سے اعلےٰ رُوحانی قوےٰ پیدا کر دے۔ ہمارے ادنےٰ ادنےٰ جذبات ہی جب بلند ہوتے ہیں تو مکارمِ اخلاق بن جاتے ہیں۔ اور جب اخلاق کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب و شائستگی حاصل ہو جاتی ہے تو رُوحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اخلاق سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے جذبات و حسیّات مفقود ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اخلاق سے مُدعا یہ ہے۔ کہ اُن ہی جذبات و حسیّات کو ایک مناسب معیار تک رکھا جاتا ہے۔ اور پھر مناسب محل و مقام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ کام رُوح کرتی ہے غرض رُوح ایک قوتِ خالقہ ہے۔ جو اِنسان کو درجۂ بہائم سے نکالکر اِنسانِ کامل کے درجہ تک پہنچاتی ہے رُوح کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہمارے جذبات کے مُضر اور نقصان دہ پہلو مفید اور نافع پہلو میں امتیاز قائم کرے۔ اور تکمیلِ اِنسانی کے لئے اوّل الذکر کو مسترد کر کے مؤخر الذکر کو قبول کرے۔ کیا رُوح وہی کام نہیں کرتی جو زندگی کسی زندہ ہستی میں کرتی ہے؟ جس طرح

زندگی ہمارے نظام جسمانی میں ایک مادّہ کا انتظام کرتی ہے
اسی طرح رُوح ہماری اخلاقی اور رُوحانی زندگی میں ایک
دوسرے قسم کے مادّہ کی منتظم ہے۔ رُوح اور زندگی کا کام
ایک ہی ہے۔ صرف اس مادّہ میں فرق ہے جس سے وہ
کام لیتی ہیں۔ دونوں پیدا کرنے والی قوتیں ہیں۔ ایک
بلاارادہ کام کرتی ہے دوسری بلاارادہ۔ کیونکہ مادی زندگی
خود بلاارادہ ہے۔ اور رُوح زندگی کے اس پہلو کے
متعلق کام کرتی ہے جن میں ارادہ ہے۔ الغرض زندگی اور
رُوح اس قوت نامیہ کے دو مختلف نام ہیں جو انسانی جسم
میں مفید و مُضر اشیاء میں امتیاز قائم کرنے کیلئے ودیعت
کی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کوئلہ اور جواہرات ایک ہی مادہ
سے بنتے ہیں۔ اور دونوں بے جان ہیں۔ مگر ایک ہی
مادّہ کی دو مختلف مقداروں کے استعمال سے یہ دو چیزیں
بن جاتی ہیں۔ اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ مرغ۔
لومڑ۔ اور آدمی ایک ہی مادّہ سے بنے ہیں۔ مگر یہاں
بھی مادّہ کے مختلف مقداروں کی وجہ سے یہ تین علیحدہ علیحدہ
ہستیاں بن گئیں۔ یہ مادہ تمام دُنیا میں ایک غیر منتظم
حالت میں موجود ہے۔ مگر مجہول قوّت نامیہ جو ہر ایک قسم
کے مادّہ کے موافق حال اسمیں ودیعت ہے مضر اجزا

اور مفید اجزا میں نہایت با قاعدگی کے ساتھ تمیز کرتی
ہے۔ اور مفید کو قبول کرتی اور مضر کو مسترد کر دیتی ہے
اسی طرح تمام انسان ایک ہی معیار پر جذبات انسانی رکھتے
ہیں۔ ڈاکو۔ راہزن اور انبیا علیہم السلام جسمانی نقطہ
نگاہ سے ایک ہی مادہ سے بنتے ہیں۔ اور ایک ہی قسم
کے جذبات رکھتے ہیں لیکن وہ قوت نامیّہ جس کو رُوح
کہتے ہیں۔ انبیاء میں طاقتور ہو جاتی ہے۔ اور
انسانوں کو کامل انسان بنا دیتی ہے۔ اور دوسرے
انسان جو اس درجہ تک نہیں پہنچتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ
اس قوتِ نامیّہ کا فعل پورا نہیں ہوتا۔ اور اُن کی تکمیل
نہیں ہوتی۔ یہی اصُول ہم انسان سے ادنےٰ درجہ کی
جاندار ہستیوں میں کام کرتا ہوُا دیکھتے ہیں۔ بسا اوقات
زندگی کے خلاف جب کوئی دوسری طاقتیں کام کرتی
ہیں اور اس کا نتیجہ ناقص نمو ہوتا ہے +

پس رُوح۔ زندگی اور قوت نامیہ تینوں مختلف
نام ایک ہی نظام عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو مختلف حالات
اور مادہ کی ترقی کے مختلف مراحل پر کام کرتے ہیں حکماء
اسلام اور محققین اُمت نے اس نکتہ کو خوب کھول کھول کر
بیان کیا ہے۔ اور انھوں نے مادہ کی ہر ایک شکل میں روح

کی ہستی کو تسلیم کیا ہے مثلاً معدنی رُوح۔ نباتاتی رُوح حیوانی رُوح اور انسانی رُوح یہ سب نام اُنھوں نے اِس قوت نامیّہ کو دیئے ہیں جو ان مختلف قسموں کی مخلوقات میں کام کر رہی ہے +

اس میں شک نہیں کہ رُوح سے مُتعلّق ہمارا علم نہایت ہی محدُود ہے۔ لیکن کیا ہم رُوح کی بہ نسبت زندگی یا مجہُول قُوّت نامیّہ سے متعلق کچھ زیادہ جانتے ہیں دُنیا میں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کی شکل و صُورت اور کاموں کے متعلق ہم بہت کم جانتے ہیں۔ اور وہ ہمارے لئے ایک مُعمّہ ہیں مثال کے طور پر ایک بجلی کو بھی دیکھ لو جسطرح رُوح کے متعلق ہمارا علم بہت ہی کم ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کچھ بھی نہیں۔ اور اس کی حقیقت ہمارے لئے ایک معمّہ ہے۔ اسی طرح زندگی بھی ہمارے لئے مُعمّہ ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان کے متعلق یہی جانتے ہیں کہ وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جو کچھ جسمانی قالب میں بلا ارادہ زندگی کرتی ہے وہی رُوح تعمیر روحانیت میں کرتی ہے ہاں فرق صرف یہ ہے کہ رُوح بالارادہ کام کرتی ہے اور زندگی بلا ارادہ +

اس اختلاف کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ زندگی کا

عمل جس مادے پر ہوتا ہے۔ اُسمیں شعور نہیں ہوتا لیکن اس کے برخلاف رُوح کا عمل انسان کو رُوحانی بنانے کیلئے اس چیز پر ہوتا ہے جس کو شعور انسانی کہتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوُں کہہ سکتے ہیں کہ انسانی جذبات و احساسات مختلفہ کو رُوح فلسفہ اخلاق و مذہب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان محض حیوانی زندگی بسر کرنے کے لئے ہی پیدا نہیں ہوُا۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ مدارجِ عالیہ پر ترقی کرتا رہے۔ اور یہ نصبُ العین رُوح کی قوتِ تمیز کی بدولت جو نیک و بد امتیاز کر سکتی ہے حاصل ہوتا ہے۔ الغرض رُوح کی حقیقت اگرچہ ہمارے لئے عقُدہ لاینحل ہے۔ لیکن تاہم اُن فرائض کے لحاظ سے جو وہ سرانجام دیتی ہے۔ ہم اس کو احکامِ الٰہی کی ایک دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ جس کے ماتحت انسان اپنی مختلف استعدادوں کی تکمیل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ربّ آیا ہے۔ اور جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے۔ اور اس کے معنی پیدا کرنیوالا۔ قائم رکھنے والا اور ترقی دینے والا ہیں۔ پس انسان کو اپنے ربّ کے حکم کے ماتحت جس نے اس میں مختلف قوے پیدا کئے

ہیں اپنے آپ کو ترقی دینا ہے۔ اور یہ حکم رُوح کے توسّل سے عمل میں آتا ہے۔ یہ راز قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت ہم پر منکشف کرتی ہے:۔

یسئلونک عن الرّوح قل الرُّوح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ تم سے لوگ رُوح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہدو کہ رُوح بھی میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔ اور تم لوگوں کو اسرارِ الٰہی میں سے بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے (سُورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۸۵)

پس جان اور رُوح جسم انسانی میں قوئے تعمیری ہیں اول الذکر ہماری مادی اور آخر الذکر رُوحانی تعمیر کرتا ہے لیکن یہ دونوں باہر سے ہمارے جسم میں داخل نہیں ہوتیں وہ مادّے کی ارتقاء کی خاص مراحل پر پیدا ہو جاتی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ کائنات کا ہر ایک ذرہ اپنے اندر وہ خصائص رکھتا ہے جو رُوحِ انسانی کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ جس کے چہرے پر سے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات بالکل پردہ اُٹھا دیتی ہیں:۔

ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ثم جعلنہ نطفۃ فی قرار مکین ۰ ثم خلقنا النطفۃ علقۃً فخلقنا العلقۃ مضغۃً فخلقنا المضغۃ

عظٰما فکسونا العظٰم لحماً ثم انشانٰہ خلقاً اٰخر ط فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین o ثم انکم بعد ذالک لمیتون o ترجمہ - اور ہم نے انسان کو مٹی کے ستّ سے بنایا - پھر ہم ہی نے اس کو حفاظت کی جگہ یعنی عورت کے رِحم میں نُطفہ بنا کر رکھا - پھر ہم ہی نے نطفے کا لوتھڑا بنایا - پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی بندھی بوٹی بنائی - پھر ہم نے بندھی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں - پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت مڑھا - پھر آخر کار ہم ہی نے اُس کو گویا بالکل دوسری ہی مخلوق کی صُورت میں بنا کھڑا کیا - پس مبارک ہے ذات اللہ تعالیٰ کی جو سب سے بہتر خالق ہے - پھر اس کے بعد تم کو مرنا ہے - سُورۃ المومنون آیت ۱۲ تا ۱۵)

مندرجہ بالا آیات سے بوضاحت پتہ لگتا ہے - کہ جسد انسانی اوّل زمین سے مٹی کے ست سے بنایا گیا اور جیسا کہ قرآن کریم ایک اور مقام پر فرماتا ہے - کہ زمین ایک گیس کے جلنے سے پیدا ہوئی - اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے - کہ یہ کُرّہ ارض اوّل اوّل حالتِ سیّال میں تھا - اس مسئلہ پر مزید بحث کرنا ہمیں اصلی مبحث سے بہت دُور لیجائیگا - جس کی ضرورت نہیں - پس ہم اسی قدر کہنے پر اکتفا کرتے

ہیں۔ کہ قرآن کریم کی رُو سے کُرّہٴ ارض مادّہ کی ایک ارتقاعی حالت ہے۔ جو جلتی ہُوئی گیس سے پیدا ہُوئی ہے۔ اور اِنسان کی پیدائش مابعد کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ مختلف منازل ارتقا کے ذکر میں مندرجہ بالا آیات میں دو حروف عطف ثم اور فا استعمال ہُوئے ہیں۔ اوّل الذکر عربی میں اِس جگہ استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کسی خاص فعل کے دو مدارج یا مراحل کے درمیان کوئی وقفہ یا مُدّت واقع ہو۔ اور آخر الذکر اس جگہ۔ جہاں ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کے بعد بغیر وقفہ کے آئے۔ اسی وجہ سے آیات مندرجہ بالا میں سلالۃٍ من طین اور نطفۃً کے درمیان جو ایکدوسرے سے بہت فاصلہ پر پڑے ہیں ثم آیا ہے لیکن نُطفہ کے قرار پکڑنے سے گوشت بننے تک ایک مرحلہ کو دوسرے مرحلہ سے ملانے کے لئے فا کا حرف اِستعمال ہُوا ہے اس کے بعد پھر ثم حرف عطف آیا ہے۔ جبکہ نطفہ گوشت اور ہڈیوں کی صُورت اختیار کرتا ہے۔ اور اس منزل سے دُور ہے جبکہ اسمیں رُوح آجاتی ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ثم انشانٰہ خلقاً اٰخر میں اس نئی صورت ہستی کی طرف اشارہ ہے۔ جو اِنسان اختیار کرتا ہے

لیکن یقیناً یہ نئی صورت باہر سے ہم میں داخل نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری ذات میں مضمر ہے ؛

یہی ایک خیال کہ رُوح اور جسم ایک نہیں بلکہ دو متفرق ہستیاں ہیں مختلف مذاہب و طریقہائے فلاسفہ میں لاانتہا اختلاف آراء کا باعث ہؤا۔ جس سے انسانی بہبودی میں بہت نقص واقع ہؤا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور خیال تناسخ یعنی آواگون کا مسئلہ ہے۔ ان مسائل نے لوگوں کو مدتوں پریشان رکھا ہے۔ کہ یوگ کفّارہ۔ رُہبانیت اور دیگر لایعنی و غلط ریاضتوں سے اطمینان قلب کی جستجو کریں۔ ان کا خیال تھا کہ رُوح اور جسم کسی قسم کی مشارکت نہیں رکھتے۔ بلکہ جسم نے رُوح کو گرفتار کر رکھا ہے۔ اور حقیقی نجات یہ ہے کہ رُوح کو اُس غلامی سے آزاد کیا جائے۔ ہر قسم کے انسانی جذبات کو پامال کرنا بڑا ہی مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم رُوئے زمین پر گروہ انسانی کے مختلف طبقات میں طرح طرح کی رُہبانیت پاتے ہیں۔ یہ بھی اس تعلیم کا جو بُدھ کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے ایک بھاری نقص ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا منشاء یہ ہے۔ کہ تمام دُنیاوی تعلقات کو منقطع کر دینا ہی سفلی

جذبات و خواہشات کو پامال کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لہٰذا سرچشمۂ راحت جاودانی تک پہنچنے کا یہی ایک پروانۂ راہداری ہے۔ یعنی روحانی پاکیزگی کا حصول تمام دُنیاوی تعلّقات کو قطع کرنے سے ہی ممکن سمجھا گیا۔ جو صریحاً خلاف فطرت عقیدہ ہے۔ پس یہ عقیدہ کہ رُوح اور جسم دو مختلف ہستیاں ہیں مختلف قسم کی رُہبانیتوں کا بانی ہُوا۔ اور رُومی کلیسیا نے خانقاہوں کا سلسلہ بھی رُوحانی بہبُودی کیلئے جاری کیا۔ جس کے ساتھ تجرد ایک لازمی شرط قرار پائی۔ ایسی طریقتیں کبھی بھی اپنے اعلےٰ اخلاق کی تربیت گاہ ثابت نہیں ہوئی ہیں بلکہ برخلاف اس کے ان سے اخلاقی امراض پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ سلسلے تہذیب و تمدّن کی ترقی کے راستے میں رُکاوٹ کا باعث ہوتے رہے ہیں +

## بعض لحُوم ممنُوعہ

مَیں پھر اب اصلی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مادّہ اپنی ہر ایک ارتقائی منزل میں اپنی آیندہ ترقی کے لئے اپنی خوراک ارتقاء مادی کی اس صُورت سے

حاصل کرتا ہے جو سلسلۂ ارتقاء میں اس سے نیچے درجہ پر واقع ہو۔ جہاں عالمِ نباتات حیوانات کو ان کی خوراک کا اکثر حصہ بہم پہنچاتا ہے۔ وہاں حیوانات بھی کسی نہ کسی صورت میں انسانی دسترخوان پر آ کر نہایت اعلیٰ غذا بہم پہنچاتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک عالم آنیوالے عالم کی پیدائش کیلئے بطور بنیاد کے حکم کرتا ہے۔ بالخصوص اس مادہ میں جو ایک ارتقائی حالت کو اس سے نچلی حالت سے نمایاں تمیز و تفریق کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر جو چیز دو ارتقائی حالتوں میں جو ایکدوسرے سے اوپر نیچے ہوں تفریق کرتی ہے مزید ترقی کو عمل میں لانے کیلئے بطور بنیاد کام کرتی ہے۔ آنیوالی عالم میں جو عنصر نیا ہے وہ اس چیز سے پیدا ہوگا۔ جو اس آنیوالے عالم سے ملحقہ نچلے عالم میں اور مؤخر الذکر سے نچلے عالم میں وجہ امتیاز ہے۔ نباتات کی نہایت ہی ترقی یافتہ صورتوں میں حرکت کی قوت پائی جاتی ہے۔ جو ترقی پاکر عالمِ حیوانات میں اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن معرفت طبعی حیوانی زندگی کا امتیاز خصوصی ہے۔ معرفت طبعی متعدد تحریکات و اضطرارات سے بنتی ہے۔ جو انسان اور حیوانات سفلی میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ تحریکات نظم حیوانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور عالم نباتات اور عالم حیوانات میں وجہ امتیاز ہیں۔ اور جسم انسانی میں مزید ترقی کے لئے

بطور تعمیری مسالہ کے کام کرتے ہیں ۔ یہ جذبات بعض حیوانات میں کامل طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن حیوان کو انسان بنانے کے لئے ضروری ہے ۔ کہ ان جذبات کی تہذیب و تربیت کیجائے ۔ اور اُن کو حدِ اعتدال میں رکھا جائے ۔ بکری حلیم الطبع ہے لیکن یہ اُسکی اخلاقی خوبی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک فطری تحریک ہے ۔ جس کو اصلی اخلاق کا جامہ پہنانے کے لئے اعتدال پر لانے کی ضرورت ہے ۔ درندے تُندی اور بہادری کا اظہار کرتے ہیں ۔ اور نباتات خور حیوانات عموماً حلیمی و بُزدلی کا اظہار کرتے ہیں ۔ اگر اُونٹ اپنی بلندی پر غُصّہ کا اِظہار کرتا ہے ۔ تو گائے بھی یہی جذبہ پُورے طور پر رکھتی ہے ۔ اور اگر جذبہ کو اعتدال کے ساتھ عمل میں لایا جائے تو سچّی حلیمی اور اِنکساری بنجاتی ہے ۔ سؤر شہوتِ نفسانی کا مجسّمہ اور ارذل ترین فطرت کا مظہر کامل ہے ۔ یہ حیوانات ایک مادّہ کے مختلف مرکّب ہیں ۔ لیکن شکل اور جذبات کا فرق اس اندازے اور تناسب کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جس سے ان کے اصلی عناصر منتخب ہو چکے ہیں ۔ پس حیوانی زندگی میں عناصر کی ہر ایک مختلف ترکیب

مختلف جذبات پیدا کرتی ہے۔ اور جہاں کہیں بھی وہ ترکیب موجود ہوگی۔ وہی جذبات اس سے پیدا ہونگے لہذا ان جانوروں کا گوشت جن میں جذبات اپنی بدترین صورت میں ظہور پاتے ہیں۔ انسانی خوراک کا جُزو نہیں بننا چاہئے۔ اِن حیوانات کے اخلاق جن کا ہم گوشت کھاتے ہیں ہمارے اخلاق پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذاہب نے بعض جانوروں کا گوشت لحوم ممنوعہ کے زمرے میں داخل کر دیا ہے۔

الغرض اِن مختلف تحریکات و جذبات کو جو حیوانی اجسام میں ترقی پاتے ہیں اعلیٰ اخلاق حسنات تک رفعت دینے کی ضرورت ہے نہ صرف امن عامہ پیدا کرنے کیلئے بلکہ اصلی انسانیت پیدا کرنے کے لئے جو اپنے کمال پر پہنچ کر مزید ترقی یعنی حیات بعد الموت کیلئے بطورِ بنیاد کے کام کرتی ہے۔ لیکن رفعت دینے کا فعل ہمارے علم متعلق اندازہ اعتدال پر منحصر ہے۔ جو مختلف صورتوں میں سالمات کی اُن کی ہر ایک منزل ارتقاء میں جو وہ اقل الخلیقہ ذرات سے انسانی جسم تک پہنچنے میں طے کرتے ہیں رہنمائی کرتا ہے۔ اگر قوت صناعی اس اندازہ کو مفید و مُضر میں تمیز کرنے

میں نادانستہ اپنے سامنے رکھتی تھی۔ اس سے ہرج واقع نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ انسانی جسم تک پہنچنے تک نشوونما غیر مُدرک تھی لیکن انسانیت اپنے ساتھ ایک نیا مقام آغاز لاتی ہے۔ یعنی معرفتِ طبعی سے ترقی کرکے کچھ پیدا کرنا ہے۔ اور ضرور ہے۔ کہ قوّت صنّاعی دانستہ اور تدبّر کے ساتھ کام کرے۔ اور کسی نہ کسی قسم کی معرفت اسکی رہبری کرے یعنی ذاتِ باری تعالےٰ الہام کے ذریعہ اسکی یاوری کرے۔ اگر بارش مادّی صُورت میں اوپر سے اسلئے آتی ہے۔ کہ مادی نظام کی تعمیر کیلئے جان پیدا کرے۔ جو انسانی جسم میں پہنچکر تکمیل پاتی ہے۔ مزید ترقی جو عقلی اور روحانی ہے ایک رُوحانی بارش چاہتی ہے۔ پس قرآن کریم اپنے آپ کو اور دیگر کتب مقدسہ کو بارش سے تشبیہ دیتا ہے +

# مسئلۂ ارتقائے انسانی

## صحیفۂ ارتقا

صحیفۂ قُدرت کا کوئی سا صفحہ مطالعہ کرو۔ تو ہر جگہ ترقی اور فلاح کا قانون بڑے شوخ حروف میں لکھا ہُوا پاؤ گے کائنات کا ہر ایک ذرہ رُو بہ ترقی ہے۔ اسمیں کچھ اس قسم

کی خداداد استعدادیں رکھ دی گئی ہیں کہ وہ خود بخود اپنے کمال کی طرف ترقی کر رہا ہے ایک بیج کچھ مدت کے بعد پودہ بن جاتا ہے۔ پھر وہی ترقی کرتے کرتے درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر ایک شجر باروربن جاتا ہے۔ گویا کہ قدرت کی بادشاہت میں ہر چیز رو بہ ترقی ہے۔ "ایک گھونگے سے لے کر ایک کلیسیا تک گھاس کے تنکے سے لے کر ایک عظیم الشان ستارہ بلوط کے درخت تک جگنو کی خفیف سی چمک سے لیکر بجلی کی ضو تک ایک جھینگر کی آواز سے لیکر اعلیٰ سے اعلےٰ مقدس راگ تک" غرض مادہ اور طاقت صورتوں اور خاص تقسیموں کے مطابق ہر وقت ایک غیر منتہی ترقی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ قدرت کی کوئی چیز ساکت یا تنزل کرنیوالی نہیں +

قدرت کے جس قدر منازل موجودہ سائنس نے معلوم کئے ہیں ان سب میں ترقی اور بڑھنا پایا جاتا ہے۔ یہ جسقدر مناظر قدرت ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اور علاوہ ازیں وہ جن کو ابھی ہم نے معلوم کرنا ہے۔ یہ سب اس وسیع عنصر کے ہر ذرہ میں قدرتی اور پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ جس کو ایتھر کہا جاتا ہے۔ اور جو تمام کائنات پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ ذرات جب ایک خاص نسبت سے

جمع ہوتے ہیں تو ان سے برقی جوہر پیدا ہو جاتے ہیں۔
اور انہی برقی جوہروں کے مختلف اجتماعوں سے مادہ
کے ذرّات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن سے تمام مادی
عالم بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد زندگی آتی ہے۔ جو خود
مادہ یا طاقت نہ ہو لیکن اس کی ترکیب مادہ اور طاقت
کی انفعالی قوّت سے بغیر کوئی کام نہ دے سکتی تھی۔ یہی
صورت جب اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ تو اس سے دماغ
پیدا ہوتا ہے جو دل سے تفکّرات کے لئے جسم کا کام
دیتا ہے۔ پھر اسی کی مزید ترقی سے احساس پیدا ہوتا
ہے جو آخر کار علم اخلاق فلسفہ اور مذہب کی اعلیٰ درجہ
کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دل جس کو عام گفتگو
میں روح کہہ دیا جاتا ہے خواہ ایک الگ ہستی ہو۔ یا اس
مادی کرّۂ ارتقا کے آخری مرتبہ ہی کا دوسرا نام ہو۔ اس
سے ہماری بحث پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ ہی اس
اختلاف رائے سے اس مسئلہ پر کوئی زد پڑتی ہے۔ کہ ہر ایک
ذرّہ قدرت رو بہ ترقی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بیرونی طاقتوں
کے قابو میں ہو لیکن یہ بیرونی اشیاء کچھ بھی فائدہ نہ دے
سکتیں اگر مادّے میں طاقت قبولیّت نہ ہوتی۔ اسمیں
ایسے خواص رکھے گئے ہیں۔ کہ وہ ترقی کرے نہ کہ تنزّل۔

مخلوق کی ہر ایک چیز اِس طرح پر بنائی گئی ہے کہ وہ ترقی کرتے کرتے اپنی حد قابلیّت کے اندر کمال حاصل کرے اِس غلط عقیدہ کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ انسان زوال پذیر ہے۔ اور اپنے اعلےٰ مقام سے گر رہا ہے بلکہ عیسائی مسئلۂ نجات کا بُطلان بھی اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے اِس قسم کے عقائد ہر قسم کی ترقی کے روکنے کے علاوہ تمام علمی اور سائنس کی صداقتوں کے خلاف ہیں۔ کائنات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اپنی ابتدائی حالت میں کمال کو پہنچی ہوئی ہو۔ آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے منزل کمالیّت حاصل ہوتا ہے۔ نجات یعنی انسانی زندگی کے مقصدِ اعظم کا حصُول کفّارہ نہیں خُدا کی کسی مخلُوق میں کوئی پیدائشی اور قدرتی نقص نہیں ہو سکتا۔ نقص تو بعد میں پیدا ہوتا ہے +

یہ ایک مُسلّم صداقت ہے اور قُدرت کا ذرّہ ذرّہ اسکی شہادت دے رہا ہے۔ اور بدیں وجہ اِنسان جو اشرفُ المخلوقات ہے۔ اور خود اپنے اندر ایک چھوٹی سی دُنیا رکھتا ہے۔ بھلا اُسکی ساخت کسطرح اِس قاعدے کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی قدرتی بزرگی میں یا اپنی ترقی کرنے کی قابلیّت میں

شک کرے تو وہ گویا اپنی فطرت اور ساخت کے خلاف کام کرتا ہے۔ انسان کو بہترین مخلوق اور صانع حقیقی کی اعلیٰ ترین صنعت قرار دیا گیا ہے تو کیا یہ لازمی نہیں کہ اس کے قوٰے اور قابلیتیں بھی سب سے افضل ہوں اس کی یہ استعدادیں اپنے کمال تک پہنچ جاویں تو اس کا درجہ اپنے خدا اور خالق کے سوا کسی سے کم نہ ہو یہ سب وجوہ اِس قدر صاف اور کھلے تھے۔ کہ ان سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کرنا قریباً محال تھا۔ لیکن پھر بھی دُنیا کو یہ معمولی سی بات سمجھنے میں ہزاروں برس لگ گئے۔ اور مذہب اگر وہ خدا کی طرف سے ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہبری کرے۔ کیونکہ الہام الٰہی کا اولین مقصد یہی ہونا چاہیئے +

مٹّی کے ناچیز اور سادہ ڈھیلوں کو جب انسانی فہم کے تحت میں لایا گیا تو بہشت جیسے باغات اِس سے پیدا ہو گئے۔ سائنس اور علوم نے ہماری مدد کی۔ اور اِس دُنیا کے جسمانی حصّے کو فرحت دہ اور مقام عیش بنا دیا۔ لیکن سائنس کوئی چیز خود پیدا نہیں کر سکتی۔ مخلوق میں ہر ایک چیز موجود تھی۔ اور جب اس کے خاص قوانین پر عمل کیا گیا تو اس کا ثمرہ ملگیا۔ سائنس کا کام صرف اِسقدر

ہے کہ وہ ان قوانین کو معلوم کرے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان جو اعلےٰ سے اعلےٰ اور افضل سے افضل قویٰ کا مرکز ہے۔ کیا وہ جسمانی مملکت کے باہر بھی کوئی قابلِ قدر ترقی کر سکتا ہے یا نہیں۔ یقیناً وہ کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو نورِ ہدایت اور صداقت ملجائے۔ اور الہام آلٰہی کی ضرورت اور غرض صرف اسی قدر ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اس نور کو مہیّا کر دے۔ اور وہ صحیفہ یا کتابیں جو یہ غرض پوری نہ کر سکیں۔ ان کی غرض قصّے کہانیوں کی کتابوں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ کلیسیائے مغربی کے پاس بھی رُومن یونانی اور ہند و قصّے کہانیوں سے بڑھ کوئی چیز نہیں جس کے ذریعے سے ایک بچّہ ترقی پا کر ایک انسان بنتا ہے۔ اور اگر چند قصّے کہانیوں کے علاوہ کُتُب سماوی میں کچھ نہ ہو تو بھلا اس میں خدائی ہاتھ یا الہام کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اعتقاد فاسدہ نے مذہب کا منصب لے لیا۔ اور لوگوں کو گمراہی اور ضلالت کے گڑھے میں ڈال دیا۔ اندھی تقلید اور ایمان بلا فہم سے انسانی دماغ اور ذہن بالکل زائل ہو گئے۔ توہم پرستی نے بھی خوب غلبہ پایا۔ اور بہت سی قوموں نے اس قسم کے عقائد اور اصُول اختیار کر لئے۔ جن کے ماننے سے نہ صرف عقل و فہم

کو خیر باد کہنا پڑا بلکہ ان کے زوال اور بربادی کا باعث ہوئے۔ انسان جس کو اشرف المخلوقات بنایا گیا تھا وہ اپنے زعم میں حقیر اور ذلیل ہوگیا۔ اور جس کو قدرت کا حاکم بنایا گیا تھا وہ اپنی محکوم قدرت کے ذرّات کا شکار ہوگیا۔ ان حالات کے ماتحت یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ مذہبی ترقی کے ابتدائی منازل میں انسان کا میلان شرک اور بت پرستی کی طرف ہوگیا۔ مذہب کی ستار پر افریقہ کے وحشیوں سے لیکر یورپ کے مہذب عیسائیوں تک ان سب نے سنگ پرستی سے لے کر آدم پرستی تک جتنی سُریں تھیں وہ سب کی سب بجائیں۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ ہو ہی کیسے سکتا تھا۔ جبکہ انسان کو یہ یقین دلادیا گیا۔ کہ وہ گناہ کے قعرِ عمیق میں گرا ہوا ہے۔ اور گناہ کو انسان کا فطرتی خاصہ سمجھا گیا۔ کہ ایک بڑے آدمی کی موت کی بابت جو تاریخی قصّے ہیں۔ اگر ان پر ایمان نہ لاؤ گے تو ابدی جہنّم اور نارِ دوزخ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔ اس سے بڑھ کر مایوس کُن اور ہمّت کی کمر توڑنے والی اور کونسی بات ہوسکتی تھی۔ پیدائشی گنہگار ہونے کا خیال ہی تمام انسانی ترقیات کو روک دینے کے لئے کافی ہے۔ اس سے تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اور کوشش کرنے یا ہاتھ پاؤں

مارنے کے خیال پر سر بسر پانی پھر جاتا ہے +

## کفّارہ پر ایمان لانا خود اپنی ہتک کرنا ہے

اگر ہم کفّارہ پر ایمان لے آویں تو ہم خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ساری نسل انسانی کی عزّت پر بٹّہ لگانے والی بات ہے۔ کفارے پر ایمان لانے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ ہم انسانی فطرت کو بہت ہی ذلیل اور گرا ہؤا مان لیں۔ اور اگر ہم پیدائشی طور پر اسقدر گرے ہُوئے نہیں تو ہم کو کفّارے کی کیا ضرورت ہم اس سے بالا ہیں ہمیں تو اِن دماغوں اور فہموں کی منطق ذرا بھی سمجھ میں نہیں آتی جو ایک طرف تو انسان کو خدا کی تصویر مانیں اور ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ انسان فطرتی طور پر گنہگار ہے۔ اسبات سے قطع نظر کرکے کہ یہ دو باتیں متضاد ہیں۔ اور اُن کا جمع کرنا عقل صحیح کا کام نہیں۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا اس قسم کے الفاظ اور عقائد سے ذات باری تعالیٰ کی توہین نہیں ہوتی۔ اگر ہم انسان کو جو خدا کی تصویر اور خلیفہ بنایا گیا ہے فطرتی اور پیدائشی گنہگار مان لیں تو نعوذ باللہ من ذالك خدا کی کیا خاک وقعت ہمارے دِل میں باقی رہیگی

اِس قسم کے عقائد کے ہوتے ہوئے کسی قسم کی ترقی کرنا سخت محال اور ناممکن ہے۔ اور مغربی ممالک میں ایسا ہی ہُوا۔ جب تک اہل یورپ پر کلیسیا کا غلبہ رہا۔ اُنہوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ہر قسم کی اصلاح کی راہ میں کلیسیا سب سے زیادہ روک اور دافع تھا۔ علوم اور سائنس کا گلا گھونٹنے کے لئے کلیسیا نے ازحد کوشش کی۔ وہ یہ کب گوارا کر سکتے تھے۔ کہ نورِ علم گرجا کی چاردیواری سے باہر جائے۔ جب کبھی کوئی ایجاد کیجاتی تو اس کو جادُو اور چالاکی سے منسوب کرکے لوگوں کو اس سے الگ رکھا جاتا۔ الغرض یوروپین تہذیب کی تاریخ میں جہاں کہیں کوئی ترقی کا زینہ حاصل ہُوا وہیں پر کلیسیا نے اُسکی سخت مخالفت کی۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کہ کلیسیا اپنی تعلیم کے مطابق حق بجانب تھا۔ اُن کا ایمان تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان اپنے اعلےٰ درجہ سے ہمیشہ کیلئے گر گیا۔ اور خُونِ مسیح کے سوا اُس کی نجات ناممکن ہوگئی ہے۔ سینٹ پال صاحب لکھتے ہیں "جس طرح ایک آدمی کے گناہ کی وجہ سے تمام انسانوں پر سزا اور لعنت کا فتویٰ چسپاں ہوگیا۔ اِسی طرح ایک آدمی کی نیکی سے تمام اِنسانوں کے لئے نجات کا حکم جاری

ہوگیا۔ پس جب ایک دفعہ مسیح کے خون پر ایمان لانے سے نجات کا ملنا یقین ہوگیا۔ تو اب ان کا فرض تھا۔ ان تمام علوم کو دباتے اور بڑھنے نہ دیتے جو اس عقیدے کو باطل ٹھیرادیں یا متزلزل کردیں +

## مذہب کی بابت باطل خیالات اور عقائد فاسدہ ترقی کے لئے سم قاتل ہیں

پس مذہب نے جو صورت یورپ میں اختیار کی وہ اس انسانی ترقی کے لئے روک بن گئی جو انسان کا مقصد اعلیٰ و اولےٰ ہونا چاہئے تھی۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی الہام الٰہی جیسی نعمت عظمےٰ کی قدر صحیح طور پر نہ کی گئی۔ خدا کو پہچان لینے اور اس کی پرستش کرنے کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ اس سے انسان بہت ترقی کرسکتا ہے۔ یہ سب سچ ہے لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ خدا کا عرفان اور اسکی پرستش کیا چیز ہے۔ اور کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اگر خدا کا عرفان صرف اس کو کہتے ہیں کہ ہم خدائے واحد کی ہستی پر ایمان لے آئیں۔ اور عبادت اس کو کہتے ہیں کہ ہم اسکو بعض صفات کا ظاہر کرنیوالا مان لیں جیسا کہ بہت سے مذہب اپنے پیرؤوں کو

سکھاتے ہیں۔ تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس عقیدے یا علم
سے ہماری ترقی میں کونسا اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس
سے تو کسی خاص مذہب کو برتر سمجھ کر اختیار کرنے کا اصول ہی
مفقود ہو جاتا ہے۔ اور بت پرستی اور شرک کی ہر ایک
شکل مہذب دنیا کے اکثر مذاہب کے متوازی اور برابر ہو جاتی ہے

## اہلِ ہند کی جدید بت پرستی اور اہلِ مغرب کی انسان پرستی

موجودہ زمانے کا بت پرست جب ایک مورتی کے آگے سجدہ کرتا ہے۔ تو وہ پتھر اس کے زعم میں ایک اوتار کے قائمقام ہوتا ہے۔ جس کا ظہور قدیم زمانے میں ہوا۔ جس نے اپنے وقت میں بڑے بڑے معجزے اور انسانی طاقت سے بالا کام کر کے دکھائے۔ اور جس نے لوگوں کو ہدایت کی۔ اور اسی وجہ سے وہ خدا کہلایا مغرب میں دوڈن۔ تھالہ اور جیوپیٹر اور ہندوستان میں رام و کرشن یہ سب انسان تھے۔ جن کو دنیا کے مختلف حصوں میں خدا نے خلق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ اپنے اپنے وقت میں ان سب میں اس قسم کے اوصاف پائے جاتے تھے جو انسانی قویٰ سے بالا معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے کی جہالت اور حسنِ عقیدت یا مبالغہ آمیز محبت نے صفاتِ الوہیت بھی اُن کی طرف منسوب کر دیں۔ اور آہستہ آہستہ

اُن کی پرستش شروع ہونے لگ گئی۔ جب یہ بزرگ وفات پاگئے۔ تو اُن کی یادکو تازہ رکھنے کے لئے اُن کے مجسمہ اور بت بنا لئے گئے۔ ایک آدمی جو جناب کرشن سے دُعا مانگے یا انکی استعانت چاہے اور اپنے دل میں ہندوؤں کے خدائے واحد کا تصوّر باندھ لے۔ کیا اس آدمی میں کوئی فرق ہوسکتا ہے۔ جو فعل تو یہی کرے لیکن کامل توجہ کو مبذول کرنے کے لئے اور تمام خیالات کو اسکی طرف منتقل کرنے کے لئے جناب کرشن کی مُورت اپنی جسمانی آنکھوں کے آگے رکھ لے۔ عقل تو ان دونوں میں فرق کرنے سے عاجز ہے +

## رومن کلیسیا بہتر اور افضل ہے

اور اسی وجہ سے ہم ہمیشہ رومن کیتھولک صاحبان کی عیسائیت کے زیادہ مدّاح ہیں۔ اگر آپ مسیح کو خدا مانتے ہیں۔ اسکو مُستجابُ الدعوات جانتے ہیں۔ اسکی استعانت پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی حضور باریتعالیٰ میں خلوص نیت سے پیش ہونا چاہتے ہیں تو مسیح کا تصوّر باندھتے ہیں تو اس سے تو یہی بہتر اور افضل تر ہے۔ کہ مسیح کے مجسمہ یا اسکی مُورت کو سامنے رکھ لیا کریں۔ تاکہ کامل توجہ دینے میں آسانی ہو جائے۔ اور اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے

تو ان دو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اگر رومن کیتھولکس مسیح اور اس کی والدہ ماجدہ کے مجسمہ سامنے رکھنے کی وجہ سے مشرک کہلا سکتے ہیں تو پراٹسٹنس اُن سے کچھ کم نہیں۔ دُعا کرتے وقت یا نماز پڑھتے وقت وہ بھی اسی قسم کی بُت پرستی میں حصّہ لیتے ہیں۔ خیر سوال تو یہ تھا کہ جب ہم مسیح کی پرستش اس کے مجسمہ کو آگے رکھ کر یا خیالی تصوّر باندھ کر کرتے ہیں تو کس طرح یہ طرزِ عبادت ہماری ترقی اور تہذیب کو مددِ دیگر عروج پر پہنچاتی ہے بفرضِ محال ہم اگر یہ بھی مان لیں کہ جناب کرشن یا جناب مسیح کو خدا کا اوتار ماننے سے خدا کو دیکھنے اور ملنے کی خواہش جو ہر دل میں جاگزین ہے پوری ہو جاتی ہے تو ان دیگر جذبات کو کیا کریں جو اس کے علاوہ انسان میں رکھے گئے ہیں مثلاً جذبۂ محبّت جذبۂ اخلاق۔ روحانی جذبہ وغیرہ۔ آخر اُن کی تکمیل کرنے اور ترقی دینے کے لئے بھی تو کوئی سامان ہونا چاہیئے تھا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ایک خیال ہمارے دل میں گذرتا ہے۔ اور پھر ہم اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن کسی انسان کو خدا کا مظہر یا اوتار ماننے سے ہمارے

خیالات یا افعال پر کونسا اثر ہو سکتا ہے کسی ایک انسان کی پرستش کرنے سے ہمارا علم یا ہماری تہذیب ہیں کونسی ترقی ہو سکتی ہے۔ الغرض یہ کہنا کہ آلہی الہام کی غرض صرف اس قدر ہے کہ چند باتیں خدا کی ذات کے متعلق بتا دی جائیں اور کچھ عبادت کی طرزیں سکھائی جائیں بہت ہی کچی اور غیر تسلی دہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ خدا غنی حمید ہے اُس کو ہماری عبادت کی کیا پرواہ ہے۔ ہماری تقدیس یا تسبیح سے اس کی عظمت یا جلال ہیں کوئی فرق نہیں آسکتا +

## انسان کیلئے اپنی اصلاح کرنا ہی بہترین تسبیح ہے

حقیقی تسبیح تو یہی ہے۔ کہ ہم وہ غرض پوری کریں جس کیلئے انسان جیسی اعلےٰ اور اشرف مخلوقات پیدا کی گئی اور الہام کو انسان کی مدد کیلئے آنا چاہیئے تھا۔ تاکہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قابل ہو جائے جس کیلئے اس کو دنیا ہیں بھیجا گیا۔ خود اپنی اصلاح ہی ایک انسان کی بہترین تسبیح ہے۔ اور جو مذہب اسبات کو فرض اولین کر کے نہ سکھائے وہ تو برائے نام مذہب ہے،

اور سراسر دھوکا ہے +

ہر ایک انسانی نظم کی غرض و غایت ترقی اور کمال کو پہنچانا ہی سمجھی جاتی ہے۔ تو پھر وہ نظم جس کا بانی مبانی خود خدائے قیوم ہو اس کو تو سب سے بڑھ کر اس منزل مقصود پر پہنچانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ کیا اب اس بات کا کافی ثبوت نہیں مل گیا کہ ہماری فطرت میں ترقی کرنے کی لاانتہا استعدادیں موجود ہیں تو پھر وہ مذہب یا وہ صحیفہ جو اس مقصد اعلےٰ کے حصول کا کوئی راہ نہ بتائے ہم کس طرح اس کو آسمانی اور الہامی مان سکتے ہیں محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر لاکھوں درود ہوں۔ کہ ان پر اس راز سربستہ کا انکشاف ہؤا۔ مندرجۂ ذیل آیات قرآنی اس حصہ کے اختتام پر ہیں جس کو ایک قسم کی تمہید یا دیباچہ کہنا چاہیئے فرمایا۔

والذین یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك وبالاخرۃ ھم یوقنون ۝ اولئك علی ھدًی من ربھم واولئك ھم المفلحون (سورہ بقرہ آیت ۳ و ۴)

**ترجمہ** ۔ اور وہ جو ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر اترا اور جو تم سے پہلوں پر اترا اور آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کے سیدھے رستے پر ہیں اور یہی مراد

پائیں گے +

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مفلحون کا لفظ استعمال کیا ہے ۔جس کا مادّہ فلاح ہے ۔ اور اس کے معنی کامیابی اور خفیہ استعدادوں کا ظہور میں آنا ہے ۔پس قرآن نے وحی الٰہی کی غرض خواہ وہ وحی نبی کریمؐ پر ہوئے یا ان سے پہلے نبیوں پر مندرجہ بالا آیات میں یہی فرمائی ہے ۔کہ انسان کی استعداد کامل ظہور پائیں ۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن پہلی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیتا ہے لیکن ان کا حقیقی اور اصلی ہونا اسی بات سے معلوم ہو سکتا ہے ۔کہ وہ کس حد تک انسانی قوے کو ترقی دینے والے ہیں ۔ہم تمام دنیا کے انبیا کے صحیفوں کو مانتے ہیں لیکن جب تک ان میں انسانی استعدادوں کی نشو ونما کے راہ نہ پائے جائیں گے ۔ ان کے اصلی یا حقیقی ہونے کے قائل نہیں ہو سکتے علےٰ ہذا القیاس تمام وہ عقائد اور اصول جو دنیا کے لوگوں نے ان کی طرف اب منسوب کر دیئے ہیں ۔ ان کو بھی ہم اس وقت تک قابل اعتماد نہیں مان سکتے ۔ جب تک کہ وہ انسان کی اصلاح میں نمایاں مدد نہ دیں

قرآن شریف کی پہلی آیت میں ۲ اللہ کا ذکر

# ربّ العالمین

سے کیا گیا ہے۔ یہ جملہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔ رب العالمین عالمین تو عالم کی جمع ہے۔ جس کے معنے دُنیا جہان ہے لیکن لفظ رب بہت کچھ باتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس میں نشوونُما کرنے۔ پالنے اور پرورش کرنے کے علاوہ تربیت کرنے تکمیل کرنے اور عروج دینے کا مفہوم بھی آجاتا ہے۔ امام راغب لفظ رب کے معنے یوں فرماتے ہیں "کسی چیز کی تربیت اِس طرح پر کرنا کہ وہ یکے بعد دیگرے مختلف مدارج و منازل طے کرتا ہُوا اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ گویا کہ تمام مخلوقات کا قیام صفتِ ربُوبیّت کے ماتحت ہے۔ جس نے نہ صرف پرورش اور زندگی کے سامان مُہیّا کئے۔ بلکہ پہلے ہی سے اس قسم کی استعدادیں اور ان کے ظہور کے ذرائع و اسباب پیدا کر دیئے۔ تاکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ یعنی تمام پوشیدہ استعدادیں و قوئے ظاہر ہوکر اصلیّت کی شکل اختیار کریں (اقتباس از انگریزی ترجمۃ القرآن از مولینا حضرت مولوی محمد علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی) گویا کہ خدا کی آخری الہامی کتاب نے شروع ہی میں ہم کو ایک ایسے خدا کی پرستش سکھائی جو ہماری تکمیل نفس میں ہمارا ناصر ومددگار

ہے ۔ یہ جملہ ربّ العالمین یعنی تمام مخلوقات کی تکمیل کرنیوالا ہم کو کائنات کے مختلف مناظر اور اُن کی ترقی کی طرف توجہ دلاتا ہے ۔ قدرت کے ہر ایک ذرّہ کی خلق اور پرورش کے علاوہ اس کی تکمیل بھی ربّ العالمین ہی کے ہاتھ میں ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا ۔ کہ ہر ذرّہ ترقی کر سکتا ہے ۔ اس میں ایسی استعدادیں موجود ہیں جن کا پتہ ابھی سائنس کو نہیں لیکن حالات مُوافق ہوتے ہی وہ اپنے کمال کی طرف قدم اُٹھاتے ہیں ۔ کیا یہ اسقدر وسیع مشاہدہ بھی ہم کو اپنی فطرت اور اپنی تکمیل کی طرف توجّہ نہیں دلاتا +

## معبود

بعض کا قول یہ ہے کہ خدا کی عبادت وشکریہ ادا کرنا اور اسکی پاکی بیان کرنا ہے ۔ اور اس کا طریقہ بعض مُقررہ الفاظ کا دوہراتا یا بعض صفاتِ الٰہی کو بعض حرکات جسمانی کے ساتھ بیان کرنا ہے ۔ اگر ہم یہ خیال کریں کہ خدا اِن حرکات جسمانی سے یا کوئی تعریف کے الفاظ سُن کر خوش ہوتا ہے ۔ تو گویا ہم نے خدا کی بڑی سخت ہتک کی ۔ اور اسکو ایک معمولی شریف اِنسان کے برابر بھی نہ سمجھا ۔ اگر

صرف مُنہ سے شکریہ کرتے رہو۔ اور لفظوں سے خُدا کی عظمت بیان کرتے رہو۔ اور ان الفاظ کے مُطابق کوئی عمل نہ کرو۔ تو حیف ہے ایسی نماز اور دُعا پر۔ یہ تو سراسر ظاہر داری اور فریب وہی ہے۔ حقیقی اور سچی عبادت تو وہ ہے جسمیں یہ کوشش کیجائے۔ کہ خود انسان صفات باریتعالےٰ کا مظہر بننے کی کوشش کرے۔ خدا سے دُعا مانگنے کا اصلی مفہوم ہی یہی ہے۔ کہ ان حالات کو پیدا کیا جائے جس کا نتیجہ خدا کی صفات کا ظہور ہو۔ جن کا ذکر ہم اپنی دعا یا نمازیں کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی دُعاؤں میں خدا کو ارحم الراحمین کہکر پُکارتے ہیں۔ تو اس کا مُدعا صرف اِس قدر ہے کہ ہم اپنے آپ کو رحم کے قابل بنائیں۔ اور خدا کا رحم ہم پر نازل ہو۔ اگر ایک مُسلم اپنی نماز کو ربّ العالمین یعنی خالق۔ پرورش کُنندہ۔ تربیّت دہندہ۔ تکمیل کُنندہ کہکر شروع کرتا ہے تو اس سے یہی مطلب تھا۔ کہ وہ سوچے کہ مجھ میں کونسی استعدادیں موجُود ہیں۔ اور جن کی تکمیل مجھے ربّ سے مانگنی چاہیئے۔ اور لفظ ربّ یعنی تکمیل کنندہ ہم کو اسبات کی ڈھارس دیتا ہے۔ کہ ہم اگر اس کام کو شروع کریں گے۔ تو خدا ضرور ہماری مدد کریگا۔ پس خدا کا آخری الہام آج سے تیرہ سو برس پہلے وہ صداقت لے کر آیا۔

جو آج بیسویں صدی عیسوی میں آ کر لوگوں کو معلوم ہوئی ہے۔ اس نے تو کفارے کو جڑھ سے اکھاڑ پھینکا۔ اور خود تکمیل نفس کی کوشش شروع کرا دی۔ اور نسل انسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسا بہتر راستہ صلاحیت اور کامیابی کا ہو سکتا تھا۔ کفارے کا عقیدہ اگر سچ بھی ہو تو اس کا نتیجہ اور فائدہ بعد از موت ملیگا۔ اور تکمیل نفس کا اصول تو اسی دُنیا میں ہم کو عروج پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ساتھ ہی زندگی بعد از موت کی فلاح ابدی اور کامل راحت حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں کرتا ۔

تمت

## مطبوعات جدیدہ مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری

# (۱) ذرات عالم کا مذہب

تفصیل مضامین:- مذہب اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سب سے بڑے طاقتور ذرے یعنے انسان کا مذہب! الہام ایک ضرورت حقہ ہے۔ تناسب مقداری ارتقا کی جان ہے اخلاق توازن جذبات کا نام ہے روح کی پیدائش اور فرائض۔ روح ایک باشعور قوت نامیہ ہے بعض لحوم ممنوعہ مسئلہ ارتقائے انسانی صحیفہ ارتقاء۔ کفارہ پر ایمان لانا خود اپنی ہتک کرنا ہے مذہب کی بابت باطل خیالات اور عقائد فاسدہ ترقی کیلئے سم قاتل ہیں اہل ہند کی جدید بت پرستی اور اہل مغرب کی انسان پرستی۔ دمن کلیسیا بہتر اور افضل ہے انسان کے لئے اپنی اصلاح کرنا ہی بہترین تسبیح ہے۔ رب العالمین معبود +

(۲) اسلام اور علوم جدیدہ

(۳) باطنیات اسلام

(۴) مطالعہ اسلام

(۵) مسلم مشنری کے ولائتی لیکچروں کا سلسلہ

حصہ اول حصہ دوم۔ حصہ سوم

(۶) مجموعہ لیکچرس اسلام

# خطبات غربیہ

مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی اڈیٹر اسلامک ریویو مجریہ انگلستان

یہ وہ معرکتہ الآرا خطبے ہیں جو حضرت خواجہ صاحب نے اپنے دوران قیام لندن میں نا آشنائیان اسلام کو اسلام سے معرف کرانے اور ان پر حقانیت اسلام متحقق کرانے کیلئے انگلستان فرانس اور سکاٹلینڈ کے مختلف مقامات پر تقریریں کیں اور لیکچر دیئے۔ اور بعض احباب کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ کرکے چھاپے گئے جو ذیل میں درج ہیں

(۱) سلسلہ خطبات غربیہ موسوم مسجد ووکنگ کے ابتدائی خطبات

(۲) " " " توحید و دعا تصوف

" " " خطبات عیدین

(۴) دہریوں اور ملحدین کو خطاب

(۵) اسلام اور دیگر مذاہب

(۶) حقوق نسواں

# مروارید ثلاثہ

## براہین نیرّہ حصّہ اوّل

معروف بہ زندہ و کامل الہام

مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب

اسمیں یہ دکھلایا گیا ہے کہ قرآن ایک خاتم اور ناطق الہامی کتاب ہے جسمیں تہذیب تمدن کے کُل قوانین موجود ہیں۔ اس ضمن میں مصنف نے ایک حکیمانہ بحث میں موجودہ تہذیب پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ کُل مذاہب دیگر کے عقائد اور اصولوں پر نہایت منطقی بحث کی ہے قیمت ۱۲/

## اُمُّ الالسنہ

معروف بہ زندہ و کامل الہام

مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب

یہ کتاب بالکل جدید تصنیف ہے۔ اور جدید مضمون پر لکھی گئی ہے۔ اپنی نوع کی یہ پہلی کتاب اُردو و انگریزی لٹریچر میں لکھی گئی ہے۔ اسمیں یہ دکھلایا گیا ہے۔ کہ عربی الہامی زبان ہے۔ اور کل دنیا کی زبانیں اس سے نکلی ہیں۔ اور ابتدا میں سب ملکوں کے آبا و اجداد عربی الاصل تھے۔ یہ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قیمت ۱۲/

## اُسوۂ حسنہ

معروف بہ زندہ و کامل نبی

مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب

اسمیں آنحضرت صلعم کا کامل نمونہ بحیثیت انسان کامل پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے اسکو پڑھ کر ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ حضرت محمد صلعم خاتم النبیین ہیں۔ اور اگر کوئی نبی کامل نبی ہو سکتا ہے تو وہ آپ کی ذات ہے۔ قیمت ۸/